دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۰۲	جمادی الآخرہ- رجب ۱۴۳۹ھ مطابق مارچ ۲۰۱۸ء	شمارہ: ۳

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 102, Issue No. 3, March 2018 मार्च 2018
Printer Publisher :- Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
Owner :- Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 20/=	Annual Subscription Rs. 200/=

Annual by Regd Post. Rs. 440/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۴۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۷۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۷۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز	یہ علم وہُنر کے گہوارے	محمد سلمان بجنوری	۳
حجیت حدیث	سرسید احمد خاں کا نظریۂ حجیتِ حدیث		
اور افکار باطلہ	بحث وتحقیق کے آئینہ میں	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی	۹
صراط مستقیم	اہل السنۃ والجماعۃ کی بارہ اہم علامتیں	مدثر جمال تونسوی	۱۹
افادات اکابر	دفاعِ اسلام میں حضرت نانوتویؒ کا عقلی استدلال	مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۲۷
اسلام اور	حضرت محمد ﷺ کی سیاسی دستاویزات		
انسانی حقوق	انسانی حقوق کی علمبردار	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۳۵
دینی رہنمائی	نام رکھنے کا اسلامی نظام	مولانا ارشاد احمد قاسمی	۴۰
دفاع حق	عقائد باطلہ کے مقابلہ کی ضرورت اور.....	مولانا شاہ عالم گورکھپوری	۵۰
مسائل وفتاویٰ		مفتیانِ دارالعلوم دیوبند	۵۳
احوال وکوائف		مولانا محمد اللہ قاسمی	۵۵
وفیات	حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم رائے پوری کا انتقال	مولانا محمد اللہ قاسمی	۵۶

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ● ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/440 روانہ فرمائیں۔
- ● ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

یہ علم وہُنر کے گہوارے

محمد سلمان بجنوری

آج کی گذارشات کا عنوان، دارالعلوم دیوبند کے شہرۂ آفاق ترانے کا پہلا فقرہ (قدرے ترمیم کے ساتھ) ہے۔ ترانۂ دارالعلوم میں جو لفظ دارالعلوم دیوبند کے لیے استعمال کیا گیا ہے، ہم نے اسی کو تمام مدارس اسلامیہ کے لیے استعمال کرلیا ہے، جس کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ علم ودانش اور ایمان ویقین کی یہ کارگاہیں جو مدارس کے نام سے متعارف ہیں، یہ سب اپنے مقصد ومنہاج اور نصب العین کے اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کا عکس جمیل اور اپنے فکری، علمی اور عملی سفر میں دارالعلوم دیوبند کی رفیق وشریک ہیں اور قدرتاً ان کی نافعیت ومعنویت اسی مزاج ومذاق اور منہج وکردار پر کاربند رہنے میں ہے جو دارالعلوم دیوبند کا امتیاز رہا ہے۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند یا مدارس اسلامیہ کی تاریخ بیان کرنا یا مدح سرائی کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ دو حقیقی امور کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور قابلِ اصلاح معاملات کے باوجود اور اس کے باوجود کہ ہمارے مدارس اپنے ماضی کے مقابلے عمومی طور پر انحطاط کا شکار ہیں، بہرحال ان مدارس کا کردار آج بھی وہی اہمیت رکھتا ہے جو اس کو پہلے حاصل تھی اور مسلمانوں کی متاعِ ایمان وعمل اور شریعت کے علمی ورثہ کے تحفظ کے لیے ان مدارس کی ضرورت آج ماضی سے بھی زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ان مدارس کو اپنا کردار مسلسل ادا کرنا ہے اور اُن کی ضرورت باقی ہے تو ان کے لیے اپنی اصلاح وترقی کے عمل سے ایک لمحہ غافل رہنا بھی سنگین جرم کے مرادف ہوگا۔

جہاں تک موجودہ دور میں بھی مدارس کی ضرورت واہمیت کا معاملہ ہے تو یہ صرف دعویٰ نہیں ہے؛ بلکہ جو شخص بھی دنیا کے حالات سے واقف ہے وہ ہماری اس رائے سے اتفاق پر مجبور ہوگا، دنیا میں تعلیم کی راہ سے جو الحاد وتشکیک اور دین بیزاری کا زہر پھیلایا جارہا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے اس کا

تریاق مدارس ہی سے مل سکتا ہے، پھر تمام ہی مسلمانوں کے لیے دین اسلام اور اس کے احکام پر مکمل اطمینان اور بھرپور یقین کی جو کیفیت مطلوب ہے اس سے ہٹانے کے لیے دنیا میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ذریعہ جو مذموم کوششیں مسلسل جاری ہیں اور اس کے لیے خاص طور پر تعلیمی اداروں کو جس طرح استعمال کیا جارہا ہے یہاں تک کہ مسلم ممالک میں بھی تعلیمی نصاب کے اسلامی کردار کو محدود سے محدود تر کرنے کی جو کارروائیاں ہوئی ہیں اور مسلسل جاری ہیں، ان خطرناک سازشوں کا مقابلہ مدارس کی تعلیم وتربیت کے علاوہ اور کس چیز سے ہوسکتا ہے؟ ایک اور پہلو جو اِن تمام معاملات سے بڑھ کر ہے وہ افکار وعقائد کا ہے۔ امت کو جس جس انداز سے باطل افکار میں مبتلا کیا گیا ہے اور کہیں اتحاد کے عنوان سے اور کہیں کسی اور طریقہ سے، ان باطل تحریکات پر پردہ ڈالنے اور اُن کے لیے میدان صاف کرنے کی جو سازشیں جاری ہیں، ان کا مقابلہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم فکر وہم مذاق مدارس کے علاوہ اور کون کرسکتا ہے یا کرنا چاہتا ہے؟

ان تمام حقائق کا تقاضا ہے کہ مدارس اسلامیہ اپنے آپ کو فکری اور عملی دونوں پہلوؤں سے صحیح بنیادوں پر استوار رکھیں اور اس سلسلے میں کسی کسل مندی یا غیر ذمہ داری کو راہ نہ دیں۔

جہاں تک فکری پہلو سے ان مدارس کے صحیح مقام کا تعین ہے، اس کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن نوراللہ مرقدہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خطبات صدارت سے ایک اقتباس پیش کردیا جائے جو اگرچہ براہ راست دارالعلوم دیوبند سے متعلق ہے؛ لیکن اسی سے اہل حق کے تمام اداروں کے فکر ومنہج کی تعیین اور وضاحت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اختصار کے ساتھ یہ سمجھنا چاہیے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے قیام کے روز اول سے آج تک الحمدللہ اسی علمی، عملی اور تہذیبی وراثت کا امین ہے جو اسے عہد خیر القرون سے قرناً بعد قرنٍ پہنچی ہے، ملتِ اسلامیہ کی توجہات کا یہ مرکز، علم وعمل کے لحاظ سے عہد خیر القرون کا نمونہ ہے، یہاں سب سے زیادہ باکمال وہ ہے جو زمان ومکان کے فاصلوں کو طے کرکے مجلس نبوت میں حاضر ہوجائے، جس سے حضراتِ صحابہؓ نے استفادہ کیا تھا، دارالعلوم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کبھی وہ رنگ قبول نہیں کیا جو صبغۃ اللہ نہیں تھا، اسی لیے مکمل یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے امت کے فرقۂ ناجیہ کی جو علامت **ما أنا عليه و أصحابي** (میرے اور میرے صحابہ کے عقیدہ وعمل کے مطابق) بیان فرمائی تھی وہ الحمدللہ دارالعلوم کے مسلک پر پوری طرح منطبق ہے، دارالعلوم گویا اس صراط مستقیم کا محافظ اور پہرے دار ہے جو حضور پاک ﷺ سے صحابہ کرامؓ کو اور صحابۂ کرام

سے تابعین کو اور صحابہ و تابعین سے ائمۂ مجتہدین کو پہنچتی رہی ہے، پھر ائمہ مجتہدین سے امت کو ہر عہد میں یہ امانت ایسے انتخاب روزگار بزرگوں کے ذریعہ منتقل ہوتی رہی جو اگرچہ انفرادی طور پر تو معصوم نہیں ہیں؛ لیکن ان کا مجموعی موقف یقیناً معصوم ہے، اس طرح الحمدللہ دین کی ابدی حفاظت ہوئی اور خداوند قادر وقیوم کا وعدۂ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُون پورا ہوتا رہا اور اسی لیے دارالعلوم کے مسلکِ حق کے مطابق قرآن کریم اور دین مبین کی صرف وہی تعبیر درست ہے جس کے حال کا رشتہ ماضی سے منقطع نہ ہوا ہو۔ چنانچہ دارالعلوم نے روز اول ہی سے قرآن کریم کو سینہ سے لگائے رکھنے کے ساتھ سنت کی اہمیت پر پورا پورا زور دیا اور قرآن وسنت کی حامل اولین جماعت یعنی حضرات صحابۂ کرام کی توقیر وعظمت، ان سے محبت اور بحیثیت طبقہ ان کے مقدس اور عدول ہونے کے عقیدے کو اپنایا۔ الغرض دارالعلوم اسی صراط مستقیم کا پاسبان ہے جو صحابۂ کرام سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خداوند عالم نے اکابر دارالعلوم کے ذریعہ گزشتہ زمانہ میں جو خدمت لی ہے وہ بے مثال ہے، بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہدایت کا کوئی رخ ایسا نہیں ہے جہاں باری تعالیٰ نے دارالعلوم کے ذریعہ منارے اور مشعلیں قائم نہ فرمادی ہوں، اسی طرح ضلالت وگمراہی کا کوئی پیچ وخم ایسا نہیں ہے جہاں باری تعالیٰ نے اس کے ذریعہ صحیح رہنمائی کے اسباب فراہم نہ کردیے ہوں، اس لیے کہ دارالعلوم کا قیام جن حالات میں عمل میں آیا تھا ان میں علماء کرام کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں اور یہ محض اللہ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے اکابر دارلعلوم کے ذریعہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرایا، فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ"۔

(خطبات صدارت حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن رحمہ اللہ، مرتبہ مولانا شوکت علی صاحب قاسمی بستوی، ص:۱۵۴-۱۵۵)

اس جگہ موقع کی مناسبت سے دو شعر یاد آگئے جو صاحبِ ترانۂ دارالعلوم حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ایک نعت کی تضمین میں سامنے آئے اور جن سے دارالعلوم دیوبند اور ان مدارس اسلامیہ کے وجود کا حقیقی پس منظر اور اُن کا شجرۂ نسب واضح ہوجاتا ہے۔ فرمایا۔

یہ اہلِ دل کا جو دارالعلوم مرکز ہے — ملا ہے سب کو یہاں کا پتہ مدینے سے
اُسی کے دم سے ہے دارالعلوم میں رونق — چلا تھا علم کا جو قافلہ مدینے سے

اس اقتباس میں دارالعلوم دیوبند اور ہمارے مدارس اسلامیہ کے فکر وعمل کے جس رُخ کی تعیین کی گئی ہے اس پر پوری بصیرت کے ساتھ کاربند رہنا اور اس کو امت میں عام کرنا ہم سب کی ذمہ داری

ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ عام مسلمانوں تک یہ فکر اس طرح پہنچائی جائے کہ وہ کسی غیر اسلامی فکر کا شکار نہ ہوں؛ بلکہ اُن میں کچھ ایسی فہم وبصیرت وجود میں آجائے کہ اگر کوئی شخص جادۂ مستقیم سے ہٹ کر باتیں کرے تو مسلمانوں کا ذہن اس کو قبول نہ کرے اور وہ صحیح غلط کے فیصلے کے لیے انہی مراکز علم وعمل کی طرف لوٹیں اور انہی کو اپنا اصل راہنما سمجھیں۔

اس علمی وفکری منہاج کی پابندی کے ساتھ، مدارس کے قیام وانتظام سے متعلق عملی معاملات ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی مدارس اسلامیہ کے لیے حضرات اکابر رحمہم اللہ نے نہایت واضح رہنما خطوط متعین کیے ہیں اور بڑے خوبصورت عملی نمونے چھوڑے ہیں، جن کی پابندی کرکے ہی اس نظام کو صحیح رُخ پر چلایا جاسکتا ہے، ان رہنما خطوط اور عملی نمونوں کا تعلق مدارس کی تاسیس وقیام سے لے کر، نظم وانتظام، تعلیم وتربیت اور فراہمی مالیات تک کے معاملات سے ہے اور اس کی ذمہ داری مدارس کے تینوں ترکیبی عناصر (انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ) پر اپنے اپنے دائرۂ کار کے اعتبار سے آتی ہے۔ اس سلسلے میں چند گذارشات اس امید کے ساتھ پیش خدمت ہیں کہ رابطۂ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کے اجلاس کی مناسبت سے یہ گذارشات مدارس کے حلقہ تک زیادہ بہتر طریقہ پر پہنچ سکیں گی اور مستحق توجہ قرار پائیں گی۔

(۱) سب سے پہلی بات تو مدارس کے قیام سے متعلق ہے، عام طور پر ہمارے نئے فضلاء مدارس قائم کررہے ہیں یا پھر قدیم مدارس سے علیحدہ ہونے والے اساتذہ یہ کام کرتے ہیں، اس عمل میں جو چیز اس کی روح کی حیثیت رکھتی ہے وہ نظر انداز ہورہی ہے اور وہ ہے تصحیح نیت۔ کیا یہ بات علماء کو بھی سمجھانی پڑے گی کہ ہر دینی عمل کی روح اخلاص نیت ہے، پھر مدارس قائم کرنے جیسا اہم اور عظیم الشان عمل اس کے بغیر کیسے مفید وبارآور ہوسکتا ہے؟ اس پہلو پر خاص نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ مدرسہ قائم کرنے کا محرک صرف اور صرف دینی ضرورت کی تکمیل اور علاقہ کا تقاضا ہو۔ اپنے اساتذہ اور بڑوں سے اور علاقہ کے سنجیدہ وسربرآوردہ محبان دین سے بھرپور مشورہ اور تمام قانونی کارروائیوں کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے اور اپنی آخرت سمجھ کر مدرسہ کا کام شروع کیا جائے۔

(۲) یہ ذہن سے نکال دیا جائے کہ مدرسہ کی کامیابی، بہت جلد طلبہ کی کثرت اور علاقہ میں شہرت سے ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اخلاص نیت اور اعلیٰ معیار پر خدمت شروع کی جائے تو یہ تمام چیزیں خود بخود حاصل ہوتی ہیں۔

(۳) کچھ لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تعلیم وتربیت میں اگر اصول کی پابندی اور ضروری سختی سے کام لیا جائے تو طلبہ ٹھہرتے نہیں ہیں اس لیے بے جا رعایت سے کام لیا جاتا ہے، یہ سوچ قطعاً غلط

ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدرسہ میں محنتی اساتذہ اور معیاری تعلیم آج بھی طلبہ کے رجوع کا اصل محرک ہے اور اس کی مثالیں ہر علاقہ میں موجود ہیں اور اگر بالفرض معیاری تعلیمی نظام سے پریشان ہوکر کوئی طالب علم جاتا ہے تو کوئی حرج نہیں، مدرسہ کو تو اپنے اصل نصب العین پر قائم رہنا ہے۔

(۴) مالیات کا مسئلہ مدارس میں بڑا اہم ہے اور اس سلسلے میں تمام اہل مدارس کو نہایت سنجیدگی سے صورت حال کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے فراہمی مالیات کا مسئلہ ہے، اس کے لیے اصول شریعت کی پابندی کے ساتھ آبرومندانہ طرز عمل اختیار کیا جائے۔ اساتذۂ مدرسہ سے یہ کام اُسی حد تک لیا جائے جس سے اُن کی تعلیمی و تدریسی ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں، مدرسہ میں اساتذہ وکارکنان کی اہمیت کا معیار فراہمی مالیات میں ان کی کارگذاری کو نہ بنایا جائے؛ بلکہ ہر شخص کا جو اصل فرض منصبی ہے اس میں اس کی کارکردگی بہتر بنانے پر توجہ دی جائے۔ فراہمی مالیات کے بعد خرچ میں بھی پوری دیانت وامانت اور ذمہ داری ملحوظ رکھی جائے۔

(۵) آج کل مدارس کے لیے جس قسم کے منفی حالات ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے کوشش کی جائے کہ ہمارے نظام میں کوئی خامی باقی نہ رہے کہ کسی کو انگلی رکھنے کا موقع ملے۔ مدارس کی زمین جائیداد اور تمام معاملات سے متعلق ضروری قانونی کارروائیوں کی تکمیل کی جائے۔ حساب کتاب کی شفافیت کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ مدارس میں آنے جانے والے لوگوں پر نظر رکھی جائے، اگر کوئی نیا آدمی تعاون کی پیشکش کرے تو اس کی بھی پوری تحقیق کر لی جائے۔

(۶) مدرسہ کا اصل مقصد تعلیم وتربیت اور افراد سازی ہے، اس کو ہر وقت پیش نظر رکھا جائے۔ تعلیمی نظام کے استحکام کے لیے امتحانات پر خاص توجہ دی جائے۔ امتحان کو رسمی کارروائی نہ بنادیا جائے، امتحانات پر طلبہ کی ترقی وتنزل کا مدار رکھا جائے۔ طلبہ کی حاضری کا اہتمام کیا جائے۔ سال میں لازمی حاضری کا فی صد طے کیا جائے اور اس کا جائزہ لے کر امتحان میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ اساتذۂ کرام بھی طلبہ کے تئیں پوری ذمہ داری، اخلاص اور شفقت ومحبت کا معاملہ کریں اور اُن کو اپنے پاس، امانت سمجھیں۔

(۷) تربیت کے نظام کو بھی حد درجہ مستحکم بنایا جائے، آج کل کے حالات میں بہتر تو یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو طلبہ کو ہر وقت مدرسہ کے اندر رہنے کا پابند بنایا جائے، اگر کسی ضرورت یا تفریح کے لیے نکلنا ناگزیر ہو تو مقررہ وقت پر واپسی کی نگرانی کی جائے، شناختی کارڈ ساتھ رکھنے کا پابند کیا جائے، نمازوں کے سلسلے میں کسی رعایت سے کام نہ لیا جائے، موبائل کے استعمال کو محدود کیا جائے اور اس کی نگرانی کی جائے۔ موقع بہ موقع تذکیر ونصیحت کا اہتمام کیا جائے۔

(۸) مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران، آپسی روابط کو بھی مخلصانہ بنیادوں پر استوار کریں، ایک دوسرے کو حریف نہ سمجھیں، سب کا مشن خدمت دین ہے۔ اس میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا ضروری ہے، اگر تعاون بھی نہ ہوسکے تو تصادم یا عدم تعاون کی تو ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۹) ہر مدرسہ اپنا نصاب الگ بنانے کی فکر نہ کرے، حتی الامکان کوشش کی جائے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے مطابق تعلیم ہو، اگر اپنی کوئی رائے ہے تو اس کو براہ راست یا بالواسطہ رابطہ مدارس اسلامیہ کے پلیٹ فارم پر پیش کیا جائے۔

(۱۰) آج کل کے حالات کے تحت بہت سے مدارس، ضروری عصری تعلیم کو مدارس کا حصہ بنارہے ہیں، ضرورت کی حدتک اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس کے نتیجے میں مدرسہ اسکول نہ بن جائے۔ بیشک ہمیں اپنے اسکولوں کی بھی شدید ضرورت ہے؛ لیکن اس کے لیے مدارس کو قربان نہ کیا جائے، مدرسہ کا نہج اور اس کا نظام اپنا ایک مخصوص انداز رکھتا ہے اور اس کی اپنی روایات واقدار ہیں، ان کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔

یہ چند گذارشات نوک قلم پر آگئیں، ان میں کوئی استیعاب مقصود نہیں ہے؛ بلکہ چند اہم امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، تاکہ ہمارے مدارس ازسرنو اپنا مقام حاصل کرسکیں اور یہ امت دوبارہ اپنے ان حقیقی مراکز سے وابستہ ہوجائے جن کا کردار یہ ہے کہ ؎

کوئی بزم ہو کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی، وہیں اِک چراغ جلا دیا

❁ ❁ ❁

سرسید احمد خاں کا نظریۂ حجیتِ حدیث
بحث وتحقیق کے آئینہ میں

(۲)

بہ قلم: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

اللہ کے نبی کی نظر میں احادیث کی آئینی حیثیت

اب آیندہ سطور میں موضوع زیر بحث سے متعلق چند احادیث نقل کی جارہی ہیں، جس سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ خود اللہ کے نبی پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اپنی احادیث وسنن کی قانونی وآئینی حیثیت کیا ہے؟

(۱) عن عبد اللّٰہ بن عمرو رضی اللّٰہ عنہما قال: کنت اکتب کل شیء اسمعہ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، ارید حفظہ فنہتنی قریش، فقالوا: انک تکتب کل شیء تسمعہ من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ورسول اللّٰہ بشر، یتکلم فی الغضب والرضاء! فاسکتّ عن الکتاب، فذکرت ذلک لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، فقال: اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما خرج منہ الا حق واشار الی شفتیہ صلی اللہ علیہ وسلم (اخرجہ الامام احمد وابوداؤد وغیرہما وھو حدیث صحیح)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں ہر وہ حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا اسے لکھ لیا کرتا تھا، اس سے میرا مقصد احادیث کی حفاظت تھی، تو قریش (کے بعض افراد) نے مجھے اس سے روکا اور کہا کہ تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہر حدیث لکھ لیتا ہے حالانکہ رسول اللہ ایک بشر اور انسان ہیں غصے اور رضامندی کی حالتوں میں گفتگو فرماتے ہیں، تو میں لکھنے سے رک گیا اور یہ پوری بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، تو آپؐ نے فرمایا:

لکھتے رہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس سے حق ہی صادر ہوتا ہے اور اپنے مبارک ہونٹوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

اس حدیث پاک میں کسی استثناء کے بغیر ہر اس حدیث کے لکھنے کا حکم ہے جو آپ کی زبان وحی ترجمان سے صادر ہوئی اور اس صراحت کے ساتھ کہ خوشی وناخوشی ہر حال میں آپؐ کے منھ سے حق بات ہی نکلتی ہے۔ حالانکہ ایک بشر سے بحالت خفگی احتیاط کے باوجود نامناسب ونادرست کلمات نکل جاتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول کا معاملہ اس سے بالاتر ہے، حفاظت خداوندی حالت رضاء کی طرح عالم غضب میں بھی آپ کو جادۂ حق پر قائم ودائم رکھتی ہے، لہٰذا آپ سے حق وصواب ہی کا صدور ہوگا۔

(۲) عن المقدام بن معدی کرب الکندی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: الا انّی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ، الا یوشك رجلٌ شبعان علی اریکتہ یقول: علیکم بھذا القرآن، فما وجدتم فیہ من حلال فاحلّوہ، وما وجدتم فیہ من حرام فحرّموہ، الحدیث (سنن ابی داؤد کتاب الاطعمہ فی باب النھی عن اکل السباع)

بغور سنو! بیشک مجھے (اللہ کی جانب سے ''الکتاب'' دی گئی ہے اور الکتاب کے ساتھ اسی جیسی (واجب العمل حدیث وسنت بھی دی گئی ہے) خبردار رہو! قریب ہے کہ آسودہ حال شخص اپنی آراستہ سیج پر (ٹیک لگائے) کہے گا کہ اسی قرآن کو لازم پکڑو پس اس میں جو چیز حلال سے پاؤ اسے حلال مانو، اور جو چیز اس میں ازقبیل حرام پاؤ اسے حرام جانو الخ۔

یہ حدیث پاک اس بارے میں نص ہے کہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام بھی قرآن کے مثل ہے، یعنی جس طرح قرآن عزیز منزل من اللہ اور واجب العمل ہے، اسی طرح احادیث رسول بھی وحی الٰہی اور واجب الامتثال ہیں، لہٰذا سنت رسول سے نظر پھیر کر صرف قرآن مقدس پر عمل کا دعویٰ بایں دلیل کہ شریعت اسلامی پر عمل درآمد کے لیے قرآن کافی ہے حدیث کی ضرورت نہیں، دعویٰ باطل ہے جو بلادت وجہالت کی پیداوار ہے، کیونکہ ہم بندوں کے لیے احادیث رسول کی تشریحات و توضیحات کے بغیر براہ راست قرآن پر مکمل طور سے عمل ممکن ہی نہیں ہے۔

حدیث کی حجیت پر اجماع ہے

پوری علمی ذمہ داری سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کے عہد خیر وصلاح سے عصر حاضر تک اکابر محدثین، ائمۂ مجتہدین اور علماء حق کی صف میں ایک فرد کی بھی نشاندہی نہیں کی جاسکتی ہے جس نے حدیث رسول کو حدیث مانتے ہوئے اس کی حجیت کا انکار کیا ہو، چنانچہ امام شافعیؒ

متوفی ۲۰۴ھ فرماتے ہیں:

(۱) ولا اعلم من الصحابة، ولا من التابعين احدًا اُخبر عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الا قبل خبره وانتهى اليه واثبتا ذلك سنة... وقال الشافعي: وصنع ذلك الذين بعد التابعين. والذين لقيناهم، كلهم يثبت الاخبار ويجعلها سنة، يُحمد من تبعها ويُعاب من خالفها، فمن فارق هذا المذهب كان عندنا مفارق سبيل اصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، واهل العلم بعدهم الى اليوم، وكان من اهل الجهالة (مفتاح الجنة للسيوطي ص ۳۲، ۴۲)

حضرات صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہر ایک کے بارے میں میری معلومات یہی ہے کہ جب بھی انھیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی خبر دی گئی تو اسے قبول کیا، اسی پر جم گئے اور اسے اپنا طریقہ بنالیا۔

آگے فرماتے ہیں:

یہی طرز عمل تبع تابعین اور ان علماء کا تھا جن سے میری ملاقات ہوئی ہے، یہ سارے کے سارے حضرات اخبار رسولؐ پر قائم رہتے اور اسے اپنا طریقہ بنالیا کرتے تھے، اور جو حدیث کی پیروی کرتا اس کی مدح وستائش کی جاتی اور جو اس کی مخالفت کرتا اسے معیوب سمجھا جاتا تھا، لہٰذا جو شخص اس مذہب سے الگ ہوگا وہ ہمارے نزدیک اصحاب رسول اور ان کے بعد کے آج تک کے علماء دین کے راستہ کو چھوڑنے والا اور اہل جہالت سے ہوگا۔

(۲) امام ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ مراتب اجماع میں لکھتے ہیں:

واتفقوا ان كلام رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اذا صحّ انه كلامه بيقين فواجب اتباعه... واتفقوا انه لا يحل ترك ما صح من الكتاب والسنة ص۱۷۵ (بحواله اضاء ات بحثية في علوم السنة النبويه ص ۵۰)

علماء کا اتفاق ہے کہ جب صحیح طور پر ثابت ہوجائے کہ یہ بالیقین کلام رسول (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) ہے تو اس کی اتباع واجب ہے... اور علماء کا اتفاق ہے کہ کتاب وسنت سے جس چیز کا ثبوت صحیح طور پر ثابت ہوجائے اس کا ترک حلال وجائز نہیں ہے۔

(۳) حافظ، محقق کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ صراحت کرتے ہیں کہ

حجية السنة ضرورية (التقرير والتحبير شرح التحرير ج۲ ص۲۳۵، حدیث کی حجیت دین میں (بدرجہ) بدیہی ہے۔

(۴) اور حافظ ابن ہمام سے پہلے علامہ سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۲ھ نے بھی یہی تصریح کی ہے، چنانچہ التلویح ج ۱ ص ۱۳۸ میں لکھتے ہیں: کون الکتاب والسنة حجة بمنزلة البدیهی (بواسطہ حجیۃ السنہ ص ۲۴۸، از ڈاکٹر عبدالغنی مصری متوفی ۱۴۰۳ھ) قرآن وحدیث کا حجت ہونا بدرجۂ بدیہی ہے۔

حدیث کی حجیت چونکہ بمنزلۂ بدیہی ہے اور باتفاق فقہاء دین کے بدیہی احکام کے انکار سے منکر دائرۂ اسلام سے نکل جاتا ہے اس لیے امام جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

ان من انکر کون حدیث النبی ﷺ قولاً کان او فعلاً. بشروطة المعروفه فی الاصول حجة کفر وخرج عن دائرة الاسلام، وحشر مع الیهود والنصاریٰ او مع من شاء اللّٰه من فرق الکفرة. (مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنة ص ۲)

بلا شبہ جس نے حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خواہ وہ قولی ہو یا فعلی انکار کیا جبکہ اس میں اصول حدیث میں مذکور معروف شرطیں موجود ہیں (یعنی وہ حدیث مقبول ومعمول بہ ہے) تو وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا، اس کا حشر یہود ونصاریٰ یا مشیت الٰہی کے مطابق کسی کافر فرقے کے ساتھ ہوگا۔

ایک اشکال اور اس کا حل

جمہور علماء دین کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ بعض ان پیش آمدہ مسائل ومعاملات میں جن میں منجانب اللہ آپؐ کو کوئی ہدایت نہیں ملی تھی بوقت ضرورت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے حکم صادر فرمائے ہیں اور اجتہاد میں صواب وخطا دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے سنت رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کو علی الاطلاق اور عمومی طور پر وحی قرار دینا جو ہر طرح کی غلطی سے بری اور پاک ہوتی ہے، کیسے درست ہوسکتا ہے؟

اس بارے میں عرض ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر احکام ہدایت ربانی کے تحت ہی صادر ہوا کرتے تھے، سنن رسول کا غالب اور اکثر سے زائد حصہ وحی الٰہی پر ہی مشتمل ہے، رہے دین ودنیا کے وہ معاملے جن میں آپؐ نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ فرمایا ہے اس میں یہ تفصیل ہے کہ رب علیم وخبیر نے آپؐ کے جس اجتہادی حکم کو بحالہ برقرار وثابت رکھا ہے (آپ کے اجتہادی احکام اکثر ایسے ہی ہیں) تو اس تقریر سے اس کا منشائے ربانی کے مطابق ہونا ظاہر ہے، اور اگر وحی الٰہی (خواہ وہ متلو ہو یا غیر متلو) کے ذریعہ آپ پر یہ حقیقت منکشف کردی گئی کہ اس حکم اجتہادی میں مراد ربانی تک آپؐ کے فکر واجتہاد کی رسائی نہیں ہوسکی ہے، اس کے بجائے حکم الٰہی یہ ہے، اس تنبیہ وتصویب کے

بعد اسی تصویبی اور اصلاح شدہ حکم کو آپ نے بیان کیا ہے، تو اس صورت کا بھی رضائے خداوندی کے مطابق ہونا واضح ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اجتہادات انھیں دوصورتوں میں دائر ہیں کہ یا تو احکم الحاکمین نے اپنی تقریر کے ذریعہ اس کی تصویب فرمادی ہے، یا اس کی اصلاح فرمادی ہے اور آپ نے اسی درست شدہ حکم کو امت تک پہنچایا ہے، لہٰذا رسولِ خدا کے اجتہادی فرمودات بھی بہرصورت رضائے الٰہی کے عین مطابق ہیں، کیونکہ یہ اجتہادی احکام اپنے ابتدائی مرحلہ میں اگرچہ وحی ربانی سے متصف ومؤید نہیں ہیں، لیکن اپنے مآل وانتہاء میں یقینی طور پر رب کریم کی وحی سے فیض یاب ہیں، اس لیے سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پورے طور پر ایسی بات سے محفوظ ہے جس سے اس کی تصدیق وتعمیل میں کسی نوع کا تردد وشبہ کیا جاسکے۔

اس وضاحت سے یہ حقیقت صبح روشن کی طرح آشکارا ہوگئی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اقوال وافعال بطریق وحی غیر متلو صادر ہوئے ہیں، یا جن اخبار واحکام کو آپ نے بطور اجتہاد بیان فرمائے ہیں یہ سب اپنی ابتداء یا انتہاء میں ثابت بالوحی ہیں، اور تصدیق وتعمیل کے لحاظ سے سب یکساں ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے، اوپر مذکور قرآنی نصوص کے عمومات سے بھی یہی ثابت ہورہا ہے کہ سنت نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام علی الاطلاق بغیر کسی تخصیص کے واجب التعمیل ہیں، اور بحیثیت ایک مسلمان کے ہم پر اس کی تشریعی وآئینی حیثیت کو تسلیم کرنا لازم ہے، علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ونبی تسلیم کرنے کا بھی تقاضا ہے کہ آپ کی ہر خبر جازم کی صداقت کا اعتراف اور ہر صریح امر ونہی کا امتثال اور فرمانبرداری کی جائے، البتہ جو حکم آپ نے بطور ظن وگمان یا بطریق مشورہ وغیرہ بیان کیے ہیں وہ خود آپ ہی کے حکم کے مطابق واجب التعمیل نہیں ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ایک ضروری تنبیہ

جب علماء حق یہ کہتے ہیں کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی علی الاطلاق واجب ہے، تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر حدیث پر عمل بدرجۂ وجوب لازم ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث پاک جس امر پر دلالت کررہی ہے اس امر کی بجاآوری کسی نہ کسی درجہ میں لازم اور ضروری ہے، لہٰذا اگر بقواعد اصول حدیث وفقہ حدیث کے الفاظ وجوب کو بیان کررہے ہیں تو اس کا کرنا واجب ہوگا، اگر حرمت کے معنی پر دلالت کررہے ہیں تو اس امر کا ترک لازم ہوگا، اگر اس سے سنت واستحباب کا ثبوت ہورہا ہے تو اس کا کرنا سنت ومستحب ہوگا، اگر الفاظ حدیث کراہت کے معنی پر دلالت کرتے ہیں تو اس کا کرنا مکروہ ہوگا، اور اگر اباحت کا اثبات ہورہا ہے تو اس امر کا کرنا مباح

ہوگا، بہرصورت کسی نہ کسی درجہ میں اس پر عمل ضروری ہوگا، ''تدبّر''۔

سرسید احمد خاں کا خودتراشیدہ نظریہ

اوپر مذکور قرآنی آیات اور احادیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام وغیرہ کی بناء پر علماء اہل سنت والجماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث (بشرطیکہ منسوخ یا دیگر احادیث کے معارض نہ ہوں) مطلقاً واجب العمل اور اسلامی احکام میں حجت ہیں۔

اس کے برخلاف سرسید احمد خاں مدعی ہیں کہ دنیاوی امور ومعاملات سے متعلق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وسنن کی اتباع وپیروی لازم نہیں ہے؛ بلکہ ان امور میں اصل اعتبار دنیوی مصالح اور منافع کا ہے، جن سے کاروبار دنیوی کا علم وتجربہ رکھنے والے ہی واقف ہوتے ہیں، لہٰذا دنیاوی امور میں وہ احادیث کی پیروی کے بجائے اپنے علم وتجربہ پر عمل کریں گے، وہ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں حدیث پاک ''**انتم اعلم بامور دنیاکم**'' پیش کرتے ہیں، (یعنی تم لوگ اپنے دنیاوی کاموں کو زیادہ جانتے ہو)

یوں تو سرسید احمد خاں دین کی فہم وتشریح میں احادیث پر مشکل ہی سے اعتماد کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک حدیث کے ثبوت میں بہت سارے خدشات وشبہات ہیں، جنھیں انھوں نے اپنی تحریروں میں تفصیل سے ذکر کیے ہیں، ان کا اس موقع پر ذکر باعث طوالت ہوگا، اگرچہ یہ وہی فرسودہ اشکالات ہیں جو ان کے پیش رو مستشرقین اور ان سے بہت پہلے فرقۂ معتزلہ سے وابستہ بعض فریب خوردۂ عقل وہوس بیان کرچکے ہیں اور علمائے حق کی طرف سے ان کے مدلل ومسکت جوابات دیے جاچکے ہیں۔

علاوہ ازیں احادیث کی اقسام متواتر، مشہور اور احاد میں سے احادیث متواترہ کو تو وہ بے چون وچرا لائق قبول سمجھتے ہیں اور احادیث مشہورہ میں جو ان کی اپنی خودساختہ تحقیق کی رو سے قابل اعتماد ہیں (جو اقل قلیل ہی ہیں) انھیں بھی قبول کرنے سے ان کو اِبا وانکار نہیں ہے، لیکن احادیث آحاد کو (جو احادیث کی اقسام میں سب سے زیادہ ہیں اور بالعموم احکام شرعیہ کا مدار انھیں پر ہے) قبول کرنے کی طرف ان کا میلان نہیں ہے، پھر اس طرح ان کے تیشۂ تنقید وتحقیق سے جو حدیثیں محفوظ بچ گئی ہیں انھیں بھی دو خانوں میں بانٹ دیا ہے: (۱) دینی معاملات ومسائل جن کے بارے میں وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات واحکامات کی تشریعی حیثیت تسلیم کرتے ہیں، (۲) دنیاوی امور ومعاملات، ان میں سنت رسول کا آئینی مقام ومرتبہ ان کے نزدیک مسلم نہیں ہے، کاروبار دنیا میں شرعی احکام کی بجا آوری کے بجائے اپنے علم وتجربہ کے مطابق عمل میں وہ اپنے آپ کو مجاز اور آزاد

باور کرتے ہیں، اس تقسیم سے انھوں نے اپنے فکر وعمل کو اطاعت رسول کی قید سے بڑی حد تک آزادی حاصل کرلی ہے، جس سے انھیں دین اسلام کی اپنی من مانی جدید تشریح وتفہیم کی بڑی گنجائش مل گئی ہے اور اس گنجائش سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے، جو ان کی تصنیف کردہ کتابوں سے واضح ہے۔

سرسید کے اس نظریہ پر بحث ونظر

اوپر مذکور نظریہ چونکہ امور دین ودنیا کی تقسیم پر قائم ہے، ساری گفتگو کا محور درحقیقت یہی تقسیم ہے، اس لیے اولین مرحلہ میں اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ امور دین اور امور دنیا میں فرق وامتیاز کا معیار کیا ہے۔ (سرسید احمد خاں جو اس تقسیم کے اولین موجد ہیں یہ ان کی ذمہ داری تھی مگر انھوں نے غالباً بعض ذہنی تحفظات کے تحت اسے واضح نہیں کیا ہے)

یہ بات تو ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ دین اور دنیا دو مختلف حقیقتیں ہیں، دونوں اپنے اپنے افعال واثرات اور نتائج وثمرات کے اعتبار سے بھی جدا ہیں، پھر بھی ایسا تو نہیں ہے کہ جسے عوام دین کہیں وہ دین اور جسے دنیا سمجھیں وہ دنیا ہے؛ بلکہ اس کا ایک معیار اور کسوٹی ہے، جس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا کہ دین کیا ہے اور دنیا کسے کہا جاسکتا ہے۔

دین اسلام ایک ایسی ضروری وبدیہی حقیقت ہے جسے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان اسی طرح سے جانتا اور پہچانتا ہے جس طرح سے اسے روشن دن اور تاریک رات کا علم وفہم ہے، معمولی پڑھا لکھا بھی جانتا ہے کہ دین اسلام زندگی بسر کرنے کا وہ منہج وطریقہ ہے جس کی تعلیم اللہ رب العزت کے رسول نے وحی ربانی کی ہدایت کے مطابق بندگانِ خدا کو دی ہے، بالفاظ دیگر دین وحی ربانی سے ماخوذ وہ دستور حیات ہے جس کو اللہ کے رسول نے نوع انسانی کو بتایا اور سکھایا ہے۔

پھر ہدایت ربانی دو نوع پر مشتمل ہے: (۱) ''امر'' یعنی وحی الٰہی نے بذریعہ حکم بعض امور کو بجا لانے اور انھیں زندگی میں نافذ اور جاری کرنے کو فرمایا ہے۔ (۲) نہی یعنی بذریعہ وحی الٰہی بعض کاموں کے ترک اور انھیں چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے، لہٰذا جن امور ومعاملات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وہدایت بذریعہ امر ونہی ثابت وموجود ہوگی وہ لازمی طور پر امور دین ہی ہوں گے، اور جن امور اور کاموں کے بارے میں بارگاہ نبوت سے کوئی حکم وہدایت ثابت نہ ہو وہ امور دنیا میں شمار ہوں گے، دینی ودنیاوی امور میں فرق وامتیاز کا صحیح معیار یہی ہے۔

خود سرسید احمد خاں کا یہ قول تہذیب الاخلاق کے حوالہ سے ابتدائی صفحہ میں گذر چکا ہے کہ ''سچا مذہب امور دنیاوی سے تعلق نہیں رکھتا'' سرسید کے عقیدت کیش ہی نہیں؛ بلکہ ان سے سوءِ ظن رکھنے

والوں کو بھی شاید اس سے انکار نہیں ہوگا کہ وہ دین اسلام کو ایک سچا دین کہتے تھے، لہٰذا خود ان کے اس قول کے مطابق بھی وہی کاروبار امور دنیا میں شامل ہوں گے جن کے بارے میں شارع نے سکوت اختیار کیا ہے، یا صراحتاً بتادیا ہے کہ فلاں کام امر دنیا ہے شریعت کا اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جو امور ومعاملات شارع کے دائرۂ احکام میں داخل ہیں وہ سب کے سب دینی امور ہی ہوں گے، مثلاً ٹرین، جہاز وغیرہ کی سواری، زراعت، باغبانی، درزی کا کام، باورچی کا کام، نجّاری، آہنگری، قدیم وجدید صنعت وحرفت وغیرہ ایسے کاروبار ہیں جن سے شریعت یعنی الٰہی قوانین ساکت وخاموش ہیں، لہٰذا یہ سب کام امور دنیا میں داخل ہوں گے، اور ''الاصل فی الاشیاء ھو الاباحۃ'' کی رُو سے ہم ان میں اپنے علم وتجربہ اور عقل وفہم کے مطابق عمل میں آزاد ہوں گے۔ اس کے برخلاف مثلاً دیوانی وفوجداری کے قوانین، عائلی احکام، معاشی قوانین اور اجتماعی زندگی وسیاسی زندگی کے معاملات وغیرہ کے بارے میں احکام کتاب الٰہی وسنت نبوی میں اجمالاً وتفصیلاً مذکور ہیں اس لیے یہ سب امور دین کے دائرہ میں داخل ہیں، انھیں دین کے زمرہ سے خارج کرکے امور دنیا قرار دینا اور ان سے متعلق قرآن وحدیث کے احکام کو نظر انداز کرکے انھیں اپنی منشا ومرضی کے مطابق انجام دینا، دین سے بے خبری یا دانستہ کج روی ہے، ایک مؤمن کامل اور عقل سلیم کا حامل کیا لمحہ بھر کے لیے بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ مالک کائنات اور اس کے فرستادہ معلم انسانیت کے یہ احکام وفرامین چونکہ اس کی نظر میں امور دنیا سے متعلق ہیں، اس لیے ان پر عمل کا وہ مخاطب یا پابند نہیں ہے؛ بلکہ ان امور کو اپنی منشا کے مطابق انجام دینے میں مختار اور آزاد ہے۔

اس صحیح اور علمائے اسلام کے معمول بہ معیار کو سرسید احمد خاں نے خلاف مقصد سمجھتے ہوئے اور اپنے مذکورہ پہلے قول سے گویا انحراف کرتے ہوئے ایک دوسرے موقع پر یوں گویا ہیں ''دنیاوی امور کا قرآن میں ذکر اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ دنیاوی معاملات بھی مذہب میں داخل ہیں'' (مقالات سرسید (۵) ص ۹)

آخر ان سے کون پوچھے کہ قرآن مبین کو دین ومذہب ہی کے احکام اور دلائل وشواہد بیان کرنے کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور قرآنی حقائق وہدایات تک بندوں کی رسائی کے لیے اس کی تشریح وتوضیح کی عظیم ذمہ داری بھی آپ کو سپرد کی گئی، لہٰذا بقول ان کے وہ دنیاوی امور ومعاملات جو قرآن میں مذکور ہیں، دین ومذہب سے ان کا تعلق نہیں ہے تو قرآن ان کا ذکر کیوں کررہا ہے؟ بہرحال اس طرح کے بے سروپا دعووں سے علمی حقائق بدلا نہیں کرتے ہیں۔

کہہ رہا ہوں جنون میں کیا کیا　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سرسید احمد خاں کی مطبوعہ تحریریں بتارہی ہیں کہ وہ دنیاوی امور کو اس قدر وسیع تر معنی میں لیتے ہیں کہ باب عقاید، وعبادات وغیرہ کے علاوہ شعبہ ہائے زندگی کے اکثر معاملات ان کے نزدیک دنیاوی امور ہی سے متعلق ہیں، جن میں وہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی سے بے نیاز ہوکر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق تصرفات کرتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ وہ اپنی ان تحریفات کے ثبوت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''**انتم اعلم بامور دنیاکم**'' کو پیش کرتے ہیں۔

آیندہ سطور میں ان کے اس استدلال بیجا پر نقد وتبصرہ ملاحظہ کیجیے:

استدلال سرسید کی حقیقت

سرسید احمد خاں جب سارے دلائل وشواہد کو نظر انداز کرکے ''انتم اعلم بامور دنیاکم'' کی رو سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تشریعی، وغیر تشریعی دو قسموں میں تقسیم کررہے تھے تو علمی وفقہی ضابطہ کے مطابق ان کی علمی امانت ودیانت کا تقاضا تھا کہ پہلے اس امر کی بحث وتحقیق کرتے کہ اس حدیث سے جو حکم وہ اخذ کررہے ہیں، کیا تلامذۂ رسول صحابۂ کرام، تابعین عظام، فقہائے مجتہدین اور ائمہ محدثین کی جماعت میں سے کسی سے اس کا یہ معنی ومطلب منقول ہے، سلف صالحین اور اسلام میں قابل اتباع شخصیتوں کے قول سے اگر ان کے فہم کو تائید حاصل ہوجاتی تو وہ اپنے اس استدلال میں حق بجانب ہوتے، بصورت دیگر دنیائے علم ودین میں ان کی یہ رائے از قبیل ابتداع ہی قرار پائے گی، جس کا شرعی حکم معلوم ہے ''عیاں راچہ بیاں''۔

آخر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ قافلہ اسلام کے ہراول دستے کے علم وفہم کی رسائی ایک ایسے اصولی مسئلہ تک نہیں ہوسکی جو حدیث سے ثابت شدہ تھا اور دس گیارہ سو سال گزر جانے کے بعد غلام ملک کی غلام قوم کے ایک فرد پر اس کا انکشاف ہوگیا۔

کس صاحب عقل وہوش کو اس سے انکار ہوگا کہ بعد کی نسلوں کا دین اور تعلیمات دین کا تمام تر سرمایہ علم وہدایت کے انھیں میناروں سے مستفید ومستنیر ہے، علوم اسلام انھیں کے طریق سے ہم تک پہنچے ہیں، یہی پیشوانِ علم ودین ہماری سند اولین ہیں، لہٰذا کسی نص شرعی کا وہ مفہوم جس کا ان کے علمی دائرہ سے تعلق نہیں، اس کے جاننے کا ہمارے پاس آخر دوسرا ذریعہ کیا ہے؟

چنانچہ معروف امام حافظ شمس الدین محمد بن احمد المعروف بہ ابن الہادی المتوفی ۷۴۴ھ لکھتے ہیں:

ولا یجوز احداث تاویل فی آیة وسنة لم یکن علی عهد السلف، ولا عرفوه، ولا بینوه للامة، فان هذا یتضمن انهم جهلوا الحق فی هذا، وضلّوا عنه، واهتدیٰ

إليه هذا المعترض المستأخر، فكيف إذا كان التاويل يخالف تاويلهم و يناقضه، وبطلانه اظهر من ان يطنب في رده، الخ (الصارم المنكى ص ٢٧٤ طبع مصر)

''جائز نہیں کسی آیت یا سنت کی ایسی نو پید تاویل کرنا جس کا عہد سلف میں وجود نہیں تھا، انھوں نے نہ تو یہ تاویل سمجھی اور نہ ہی امت سے اس کو بیان کیا، کیونکہ (یہ جدید تاویل) اس بات کو متضمن ہے کہ سلف اس بارے میں حق سے جاہل رہ گئے اور بہک گئے اور یہ بعد میں آنے والا اس تک پہنچ گیا، پھر جب اس پیچھے آنے والے کی تاویل سلف کی تاویل کے مخالف ومناقض ہو تو اس نو پید تاویل کا باطل ہونا اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کی تردید میں اطناب وتفصیل کی چنداں ضرورت نہیں''

لہٰذا سرسید خاں اس حدیث کا جو مفہوم ومراد بیان کررہے ہیں، چونکہ اس میں ان کا کوئی سلف نہیں ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ ان کے ذہن فاسد اور فہم کاسد کی پیداوار ہے، جس کی سرے سے کوئی سند نہیں ہے، تو ایسی بے سند بات کی علم وعقل کی دنیا میں یہی حیثیت ہے کہ اسے باہر گلی میں پھینک دیا جائے۔

علاوہ ازیں سرسید خاں کی تعلیم وتحصیل کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ان کا علمی سرمایہ (جو انھوں نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیا تھا) ناقص تھا، ان کے مشہور سوانح نگار (جو سرسید کے ہواخواہوں میں سے تھے) مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ہے:

''سرسید نے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی'' (حیات جاوید ج۲ ص۴) اور خود سرسید اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ''میری نسبت لکھ دینا کہ بہت ذی علم وفاضل اکمل ہیں کیسی غلط بات ہے'' (مکتوب سرسید جلد۲ ص۱۷۵) ظاہر ہے ایسا ادھورے علم کا حامل، جب اپنی کم علمی کے باوجود قرآن وحدیث کی نصوص میں دخل اندازی کرے گا تو اس کے فکر وقلم سے کیسے کیسے افسوسناک عجائب وغرائب رونما ہوں گے ان کی تحریروں سے، اس کا اندازہ ہر صاحب علم وفہم کو ہوسکتا ہے۔

اس اصولی گفتگو کے بعد آیئے سرسید خاں کے استدلال واستنباط پر نظر ڈالیں، لیکن اس سے پہلے کہ ہم ان کے استدلال کو علمی قواعد واصول کے معیار پر پرکھیں، ایک اہم نکتہ کا ذکر ضروری ہے جس سے زیر بحث مسئلہ کی تفہیم میں ان شاء اللہ سہولت وآسانی ہوگی۔

(باقی آئندہ)

❁ ❁ ❁

اہل السنۃ والجماعۃ کی بارہ اَہم علامتیں

(وصایا امام اعظم امام ابوحنیفہؒ سے)

ترجمہ: مدثر جمال تونسوی
اُستاذ الحدیث جامعہ الصابر، بہاول پور

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۵۰ھ) کی مختلف وصیتیں ہیں جو ان کے مختلف شاگردوں سے منقول ہیں۔اس وقت جس وصیت کا ترجمہ پیش کرنا مقصود ہے، یہ وصیت عقائد کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور یہ وصیت امام صاحب کے نامور شاگرد امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۸۲ھ) کی روایت سے نقل ہوئی ہے۔اس میں امام صاحب نے اہل السنۃ والجماعۃ کی بارہ علامات بیان فرمائی ہیں، اگرچہ مزید غور سے دیکھا جائے تو ہر علامت متعدد مضامین پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عقائد کے یہ مضامین بارہ سے زیادہ بن جاتے ہیں؛ مگر ہم نے امام صاحب کے بیان کے موافق ان علامات کو بارہ کے عدد سے ہی ذکر کیا ہے اور جس قدر مضمون ایک علامت کے تحت امام صاحب کی اس وصیت میں درج ہے ہم نے بھی اسی طرح اس کو باقی رکھا ہے۔

اس وصیت کی ایک معروف شرح مصر کے معروف حنفی فقیہ واصولی علامہ اکمل الدین محمد بن محمد البابرتی حنفی (متوفی ۷۸۶ھ) نے تحریر کی ہے۔ جسے عصر حاضر میں الدکتور محمد صجی عایدی اور الدکتور حمزہ محمد وسیم البکری نے تحقیق وتخریج اور تعلیق کے ساتھ شائع کیا ہے۔اور یہ نسخہ دار الفتح، اردن سے شائع ہوا ہے۔

اسی شرح کے آغاز سے قارئین کی سہولت کے لیے وصیت کا متن الگ سے بھی شامل کیا گیا ہے۔ بندہ ناچیز نے اسی متن کو سامنے رکھ کر اس کا عام فہم ترجمہ کیا ہے۔اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے قبول فرمائیں۔

آغاز ترجمہ

میرے دوستو اور میرے بھائیو! جان لو کہ اہل السنۃ والجماعۃ کی بارہ علامتیں ہیں، جو ان پر

استقامت کے ساتھ قائم رہے گا وہ نہ تو بدعتی شمار ہوگا اور نہ ہی خواہش پرست۔ لہٰذا تم ان بارہ باتوں پر مضبوطی سے قائم رہو؛ تاکہ سیدنا محمد علیہ الصلاۃ والسلام کی شفاعت کے حق دار بن سکو۔

پہلی علامت

ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے۔

فقط زبانی اقرار، ایمان نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر یہ ایمان ہوتا تو منافق سارے کے سارے مومن ہوتے۔

اسی طرح محض معرفت اور پہچان بھی ایمان نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر یہ ایمان ہوتی، تو اہلِ کتاب سب کے سب مومن ہوتے۔

اللہ تعالی نے منافقوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ. ترجمہ: اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بول رہے ہیں۔ (سورۃ المنافقون:۱)

اور اللہ تعالی نے اہلِ کتاب کے بارے میں فرمایا ہے:

وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے (پہلے) کتاب دی ہے وہ انھیں (نبی کریم ﷺ) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ:۱۴۶)

ایمان نہ تو زیادہ ہوتا ہے اور نہ ہی کم؛ کیوں کہ ایمان کی کمی تب ہی تصور میں آسکتی ہے جب کہ کفر میں اضافہ مانا جائے اور اسی طرح ایمان میں اضافہ تبھی مانا جاسکتا؛ جب کہ کفر میں کمی مانی جائے اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی بندہ ایک ہی حالت میں مومن بھی ہو اور کافر بھی؟

اور جو مومن ہوتا ہے وہ پکا مومن ہوتا ہے اور جو کافر ہوتا ہے وہ پکا کافر ہوتا ہے۔ ایمان میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی؛ جیسا کہ کفر میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقّاً (سورۃ الانفال:۴) ترجمہ: یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

اور فرمایا:

أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقّاً (سورۃ النساء:۱۵۱) ترجمہ: یہی لوگ کافر ہیں پکے۔

اور ہمارے نبی محمد ﷺ کی امت کے جو گناہ گار افراد ہیں وہ سب کے سب مومن ہیں، کافر نہیں ہیں۔

اور عمل، ایمان دونوں الگ الگ حقیقت ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ بہت سے ایسے مواقع میں جب مومن بندے سے عمل معاف ہو جاتا ہے اس وقت یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ اس سے ایمان معاف ہوگیا ہے؛ چنانچہ حیض والی عورت کو اللہ سبحانہ وتعالی نے نماز معاف کی ہے، اب اس موقع پر یوں کہنا جائز نہیں ہے کہ اس سے ایمان معاف ہوگیا ہے اور اسے حیض کی حالت میں ایمان چھوڑنے کا حکم ہے۔ اسی طرح حیض والی عورت سے شارع نے یہ تو کہا ہے کہ روزے چھوڑ دو، پھر بعد میں ان کی قضا کرنا؛ مگر اس موقع پر یوں کہنا درست نہیں ہے کہ ایمان چھوڑ دو، پھر ایمان کی قضا کر لینا۔ اسی طرح یوں کہنا تو درست ہے کہ فقیر پر زکوۃ فرض نہیں ہے؛ مگر یوں کہنا درست نہیں ہے کہ فقیر پر ایمان فرض نہیں۔

اور ہر اچھی اور بُری تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے؛ چنانچہ اگر کوئی یہ گمان رکھتا ہو کہ اچھائی یا بُرائی کی تقدیر اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور سے ہوتی ہے تو وہ اللہ تعالی کے ساتھ کفر کرنے والا ہوگا اور اس کی توحید بے کار ہوگی۔

دوسری علامت

ہم اِقرار کرتے ہیں کہ اعمال تین قسم کے ہیں:

فرض فضیلت معصیت

فرض: اللہ تعالی کے حکم، اس کی مشیت، اس کی محبت، اس کی رضا، اس کی قضا، اس کی تقدیر، اس کی تخلیق، اس کے حکم، اس کے علم، اس کی توفیق سے ہوتا ہے اور لوح محفوظ میں اس کی طرف سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔

جب کہ فضیلت میں اللہ تعالی کا امر شامل نہیں ہوتا؛ البتہ اس کی مشیت، اس کی محبت، اس کی رضا، اس کی قضا، اس کی تقدیر، اس کا حکم، اس کا علم، اس کی توفیق وتخلیق سے ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی طرف سے لوحِ محفوظ میں لکھا ہوتا ہے۔

اور معصیت میں اللہ تعالی کا امر نہیں ہوتا اور مشیت ہوتی ہے؛ لیکن محبت نہیں ہوتی، اس کی قضا ہوتی ہے؛ لیکن رضا نہیں ہوتی، اس کی تقدیر ہوتی ہے؛ لیکن اس کی توفیق نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ اس کی طرف سے (گناہ کرنے والے کے لیے) رسوائی ہوتی ہے، ہاں یہ اللہ تعالی کے علم میں ضرور ہوتی ہے اور لوح محفوظ میں بھی لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

تیسری علامت

ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا؛ مگر نہ تو وہ عرش کا محتاج ہے اور نہ ہی اس پر قرار پکڑے ہوئے ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عرش ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور مخلوق وہی بغیر کسی محتاجی کے اپنے اوپر لیے ہوئے ہے؛ کیوں کہ اگر وہ محتاج ہوتا تو کائنات کو وجود دینے اور اس میں تدبیر کرنے کی قدرت نہ رکھتا جیسا کہ مخلوق (بوجہ محتاج ہونے کے) ان باتوں پر قدرت نہیں رکھتی۔ اسی طرح اگر وہ بیٹھنے اور ٹھکانہ پکڑنے کا محتاج ہوتا تو وہ سوال یہ ہے کہ وہ عرش کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں (بیٹھا ہوا) تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (بات یعنی محتاج ہونے، بیٹھنے اور ٹھکانہ پکڑنے) سے پاک اور بلند شان والے ہیں۔

چوتھی علامت

ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مخلوق نہیں ہے۔ اسی نے اس کی وحی کی ہے اور اسی نے اِسے اُتارا ہے؛ یہ نہ تو عین اس کی ذات ہے اور نہ ہی اس کا غیر ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اُس کی صفت ہے۔

یہ قرآن مصاحف میں لکھا ہوا ہے۔ زبان سے پڑھا جاتا ہے۔ سینوں میں محفوظ ہوتا ہے؛ مگر اِن چیزوں میں اُتر کر ان کا جزو (اور ان چیزوں کی صفت) نہیں بن جاتا اور یہ روشنائی، کاغذ اور کتابت سب کی سب چیزیں مخلوق ہیں؛ کیوں کہ یہ سب چیزیں بندوں کا فعل ہیں، اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کلام مخلوق نہیں ہے؛ کیوں کہ کتابت اور حروف اور کلمات و آیات قرآن کریم کی نشاندہی کرتے ہیں کیوں کہ بندے ان کے محتاج ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ البتہ اس کلام کا مفہوم اور معنی و مطلب انھیں چیزوں کے ذریعے سمجھ میں آتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق ہے، وہ اللہ کے ساتھ کفر کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے معبود ہے۔ اس کا کلام بے شک پڑھا بھی جاتا ہے، لکھا بھی جاتا ہے اور یاد بھی کیا جاتا ہے؛ مگر اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جُدا اور الگ نہیں ہوتا۔

پانچویں علامت

ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ اس امت میں ہمارے نبی محمد ﷺ کے بعد سب سے افضل سیدنا ابوبکر صدیق، ان کے بعد سیدنا عمر، ان کے بعد سیدنا عثمان اور ان کے بعد سیدنا علی، رضوان اللہ

علیہم اجمعین ہیں۔اللہ تعالی کا درج ذیل فرمان اس کی بنیاد ہے:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ، أُوْلٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ، فِيْ جَنَّاتِ النَّعِيْمِ (سورۃ الواقعہ:۱۰-۱۲)

چنانچہ جو بھی سب سے آگے ہے وہ اسی حساب سے سب سے افضل ہے۔

ان حضرات سے ہر وہ شخص جو مومن اور متقی ہے محبت رکھتا ہے اور جو منافق اور بد بخت ہے وہ اِن سے بغض رکھتا ہے۔

چھٹی علامت

ہم اس کا بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ انسان اپنے اعمال، اپنے اِقرار اور اپنی معرفت سمیت مخلوق ہے؛ کیوں کہ جب ان کاموں کا فاعل (یعنی انسان) مخلوق ہے تو اس کے اَفعال بدرجۂ اولیٰ مخلوق ہوئے۔

ساتویں علامت

ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے ہی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔مخلوق کی اپنی کوئی طاقت نہیں تھی؛ کیوں کہ مخلوق تو نری عاجز اور کمزور ہے اور اللہ تعالی ہی ان کا خالق اور ان کا رازق ہے۔

اللہ تعالی کا درج ذیل فرمان اس کی دلیل ہے:

اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (سورۃ الروم:۴۰)

اللہ ہی وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیتا ہے، پھر تمہیں موت دے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا۔

کمائی کرنا حلال ہے اور حلال مال سے مال جمع کرنا بھی حلال ہے؛ البتہ حرام مال سے مال جمع کرنا حرام ہے۔

لوگ تین قسم کے ہیں:

ایک وہ مومن جو اپنے ایمان میں مخلص ہے۔

دوسرا وہ کافر جو اپنے انکار اور ضد میں اپنے کفر پر اڑا ہوا ہے۔

تیسرا وہ جو منافق اور اپنے نفاق میں مداہن (دوسروں کو دھوکے میں رکھنے والا) ہے۔

اب اللہ تعالی نے مخلص مومن پر عمل کرنا، کافر پر ایمان لانا اور منافق پر اخلاص اختیار کرنا فرض فرمایا ہے۔

اللہ تعالی کا درج ذیل فرمان میں یہی اشارہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ (النساء:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو!
مطلب اس کا یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم فرماں برداری والے اعمال بجالاؤ!
اے کافرو! تم ایمان لے آؤ!
اور اے منافقو! تم مخلص بن جاؤ!

آٹھویں علامت

ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ استطاعت فعل کے ساتھ وجود پذیر ہوتی ہے۔ استطاعت نہ تو فعل سے پہلے ہوتی ہے اور نہ ہی فعل کے بعد؛ کیوں کہ اگر فعل سے پہلے ہو تو بندہ ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ سے بے نیاز قرار پایا اور یہ بات نص قرآنی کے خلاف ہے:

وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاء (سورۃ محمد:۳۸) ترجمہ: اور اللہ ہی بے نیاز ہے جب کہ تم تو محتاج ہو۔

اور اگر استطاعت فعل کے بعد ہو تو یہ ناممکنات میں سے ہے؛ کیوں کہ اس طرح لازم آئے گا کہ وہ فعل استطاعت اور طاقت کے بغیر وجود پذیر ہوا ہے۔

نویں علامت

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا (شرعاً) ثابت ہے، مقیم کے لیے ایک دن رات اور مسافر کے لیے تین دن رات؛ کیوں کہ حدیث میں اسی طرح وارد ہوا ہے اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہو اس پر کفر کا خوف ہے؛ کیوں کہ یہ حدیث خبر متواتر کے قریب قریب ہے۔

اور سفر میں روزے کی رخصت اور نماز کا قصر بھی نص قرآنی سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُواْ مِنَ الصَّلَوةِ (سورۃ النساء:۱۰۱) ترجمہ: اور جب تم زمین پر سفر کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہوگا کہ تم نماز میں قصر کرلو

اور روزے کی رخصت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۴)
چنانچہ تم میں سے جو شخص بیمار یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے!

دسویں علامت

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو لکھنے کا حکم دیا، تو قلم نے پوچھا: اے میرے رب! میں کیا چیز لکھوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو وہ سب لکھ دے جو قیامت تک ہونے والا

ہے،اس کی دلیل اللہ تعالی کا درج ذیل فرمان ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ (سورۃ القمر:۵۲-۵۳)

اور ہر وہ چیز جوانہوں نے کی وہ صحیفوں میں ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔

گیارھوں علامت

ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ عذاب قبر بھی یقیناً ہونے والا ہے اور منکر ونکیر کا سوال بھی برحق ہے اور اس کی بنیاد احادیث نبویہ ہیں۔

اور جنت وجہنم بھی برحق ہیں اور وہ دونوں اپنے اپنے لوگوں کے لیے پیدا ہوچکی ہیں؛ چنانچہ ایمان والوں کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (سورۃ آل عمران:۱۳۳) ترجمہ: (وہ جنت) متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اور کافروں کے بارے میں فرمان ہے:

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (سورۃ البقرۃ:۲۴، آل عمران:۱۳۱) ترجمہ: (وہ جہنم) کافروں کے لیے تیار کی جاچکی ہے۔

اللہ تعالی نے ان جگہوں کو ثواب اور عقاب کے لیے پیدا کیا ہے۔

اور اعمال نامہ (تُلنے کا ترازو) بھی برحق ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (سورۃ الانبیاء:۴۷) ترجمہ: اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے۔

اور اعمال ناموں کا پڑھا جانا بھی برحق ہے۔اللہ تعالیٰ کا درج ذیل فرمان اس کی دلیل ہے:

اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيباً (سورۃ الاسراء:۱۴)

ترجمہ: (قیامت کے دن بندے سے کہا جائے گا) تو اپنا اعمال نامہ پڑھ، آج یہ اعمال نامہ ہی تیرے بارے میں حساب بتانے کے لیے کافی ہے۔

بارھویں علامت

ہم اس بات کا اِقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالی ان انسانوں کو جزا وثواب اور ادائے حقوق کے لیے موت کے بعد زندہ کریں گے اور انھیں ایسے دن میں اُٹھائیں گے جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔

اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے:

وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ (سورۃ الحج:۷) ترجمہ: اللہ تعالی زندہ کر اُٹھائیں گے قبر والوں کو۔

اور اہلِ جنت کی اللہ تعالی سے ملاقات برحق ہے اور یہ ملاقات کیفیت، تشبیہ اور جہت سے پاک ہوگی۔ (یعنی اللہ تعالی کی نہ تو کوئی کیفیت ہے، نہ کسی کے ساتھ مشابہت ہے اور نہ ہی اللہ تعالی کسی جہت میں ہیں)۔

اور ہمارے نبی محمد ﷺ کی شفاعت برحق ہے اور یہ ہر اُس شخص کے لیے ہوگی جو اہلِ جنت میں سے ہے اگر چہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو۔

اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالی عنہا کے بعد تمام عورتوں سے افضل سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا ہیں اور وہ زنا کی تہمت سے اور روافض جو نقائص کی اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُن سب سے پاک ہیں؛ بلکہ جو شخص ان پر زنا کی تہمت لگاتا ہے وہ خود زنا کی پیداوار ہے۔

اور اہل جنت جنت میں ہمیشہ رہیں گے؛ جب کہ اہل جہنم جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کی دلیل اللہ تعالی کے درج ذیل فرامین ہیں، اہل جنت کے بارے میں ارشاد ہے:

أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرۃ:۸۲) ترجمہ: یہ جنتی ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اور کفار کے بارے میں ارشاد ہے:

أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرۃ:۳۹) ترجمہ: یہ دوزخ والے ہیں جو اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

❁ ❁ ❁

دفاعِ اسلام میں حضرت نانوتویؒ کا عقلی استدلال

(۱)

از: مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی
مدرس دارالعلوم حیدرآباد

تیرھویں صدی میں جب کہ انگریز ہندوستان میں برسرِ اقتدار آگئے اور اپنے ساتھ ساتھ فلسفۂ جدید اور سائنس کی ترقیات لے کر نمایاں ہوئے، اور سائنس نے مادہ کی ہزار ہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیے، جس کی وجہ سے دنیا مخفی اور پنہاں چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہوگئی اور دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گذر کر محسوسات ومشاہدات کی گرفت میں آگئی تو قدرتی طور سے پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا، اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعوی اس وقت تک قابلِ سماعت نہیں رہا؛ جب تک کہ وہ معقولات کے ساتھ محسوس شواہد سے محسوس کرکے نہ پیش کیا جائے اور اِس طرح سے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات سے حملے شروع ہوئے۔

اِس ضرورت کی تکمیل کے لیے حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانیِ دارالعلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجہ کے لیے بطور طبیب اور مصلحِ امت کے ظاہر فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ ان بندگانِ سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو انھیں کے مسلمات سے جھنجھوڑا اور منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے جہاں خالص عقلی دلائل کی روشنی میں جوابات دیئے وہیں ان جوابات کو آج کے محسوسات اور حسی شواہد ونظائر سے مدلل فرمایا جو اُس دور کا اہم تقاضا تھا۔(۱)

حضرت نانوتوی کا مشن

حضرت حجۃ الاسلام نے منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے جو جوابات دیئے اور ان کا کامیاب تعاقب کیا، درحقیقت یہ آپ کی زندگی کا اصل مقصد تھا؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جب دینِ اسلام کا تقاضہ ہوتا تھا تو آپ کے فضل وکمال پر جتنے حجابات پڑے رہتے تھے، وہ یک بیک

اٹھ جاتے تھے پھر شرعی جوابات کی ضرورت ہو یا عقلی؛ سب حاضر؛ وہ بھی اِس طرح کہ احساسِ فضل وکمال اور ہمہ دانی کے غرور سے تنی ہوئی گردنیں بھی آپ کے سامنے خم ہوجاتی تھیں، تاریخ اس کی شاہد ہے، مختلف ادیان سے مناظرے کے بعد حضرت حجۃ الاسلام نانوتوی کے تئیں حضرت مولانا یعقوب نانوتوی (م:۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء) کا تأثر پڑھیے۔

''اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا اور وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتھے میں اسلام کی ایک منادی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر پوری ہوجائے''۔(۲)

حضرت نانوتوی کی دوررس نگاہیں

اوپر کے اقتباس سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام کی زندگی کا مشن کیا تھا؟ اِس کے ساتھ ساتھ تاریخ شاہد ہے کہ ان عقلی اعتراضات کے جوابات سے حضرت حجۃ الاسلام کا مقصد ایسے رجالِ کار پیدا کرنا بھی تھا جو اِس ملک میں اسلام کو درپیش خطروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کرسکیں، اسلام کے تحفظ وبقا اور دفاع کا جوش اور ولولہ ان کے دلوں میں ہو اور دفاعِ اسلام کی راہ میں ہر طرح کی جانی ومالی قربانیاں دینے کے لیے تیار ہوں؛ چنانچہ حضرت حجۃ الاسلام کی تحریرات نے آنے والی نسلوں کے لیے کتنی راہیں کھول دیں اور عقلیات کے تعلق سے کتنے کام ہوئے اور ہورہے ہیں، سب اسی تحریکِ قاسمی کی کڑیاں ہیں، حضرت نانوتوی نے ایک چراغ جلایا، جس سے نہ جانے کتنے چراغ جلے، بڑھے اور عالمِ اسلام کو روشن کیا، ورنہ ۱۸۵۷ء کے حالات نے ہندوستان میں ساری بساط ہی الٹ دی تھی۔(۳)

حضرت نانوتوی کا علمی مقام

حضرت نانوتویؒ نے منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے جو جوابات دیے ہیں، ان میں تحقیقی نکات، تجزیاتی معلومات اور استدلالی لطائف اور مسکت طرزِ استدلال اور عام فہم مثالوں کا جو حسین سنگم ملتا ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے، معقولات ومحسوسات کے ذریعہ گفتگو کرنے والوں کی تعداد کم نہیں؛ لیکن ایسے لوگ جن کی معقولیت کا جادو سر چڑھ کر بولے بہت کم ہیں، حضرت حجۃ الاسلام کو اِس میدان میں ''ہراول دستہ'' کی حیثیت حاصل ہے، یہ ایک یقینی امر ہے کہ عقلیات کے مسلمات کے لیے نقلیات پر گرفت از حد ضروری ہے؛ اِسی لیے حضرت حجۃ الاسلام کا نظریہ تھا کہ عقل کی کوئی بات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہونی چاہیے، حضرت حجۃ الاسلام کو نقلیات پر کتنی گرفت تھی؟ آپ کے

جوابات کے بنیادی عناصر کیا تھے؟ بہتر ہے کہ اِس پس منظر کے لیے چند اقتباسات نقل کردیے جائیں۔

''سفینۂ رحمانی'' فارسی زبان میں نثر کا نہایت عمدہ شاہ کار ہے، کتاب کے مؤلف نے حجۃ الاسلام کے تئیں جو کچھ لکھا وہ مبنی برحقیقت ہے:

''بیشۂ فضل وکمال کے شیر؛ گلزارِ عشقِ الٰہی کی خوشبو؛ بستانِ طریقت وشریعت کی شمع؛ آسمانِ حقیقت ومعرفت کے خورشید؛ عالم کامل اور جودوسخا میں رشکِ حاتم جناب حضرت مولوی محمد قاسم صاحب (اللہ ان کی قبر منور فرمائے) قصبۂ نانوتہ کے برگزیدہ علماء وفضلاء میں سے تھے، طرح طرح کے علوم کی منزلیں اور قسم قسم کے فنون کے رموز کے نشیب وفراز انھوں نے اپنی خداداد ہمت واستعداد سے کامل طور پر طے کیے تھے، انھیں کانِ علوم اور مخزنِ فنون کہنا چاہیے....''(۴)

''حدائق الحنفیہ'': علماءِ حنفیہ کا اردو زبان میں نہایت مستند ومشہور تذکرہ ہے، مولفِ کتاب نے حجۃ الاسلام کا ذکر یوں کیا ہے:

''علامہ عصر، فہامۂ دہر، فاضلِ متبحر، مناظر، مباحث، حسن التقریر، ذہین، معقولات کے گویا پتلے تھے، آپ لڑکپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش اور جری تھے، مکتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے....''

آگے لکھتے ہیں:

''اور اِس طرح مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی نے سنے، نہ سمجھے اور عجائب وغرائب تحقیقات ہر فن میں کرتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ وبُن تک ہو، ہوجاتی تھی''۔(۵)

شیخ العرب والعجم قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ نورہ اللہ مرقدہ (م:۱۳۱۷ھ) جو حضرت حجۃ الاسلام کے پیرومرشد ہیں ان کا قولِ فیصل پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے؛ چناں چہ حضرت شمس تبریز کے واسطے مولانا رومی کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو، مولانا قاسم لسان عطا ہوئے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے، مولوی صاحب اس کو بیان کردیتے ہیں''۔(۶)

حضرت نانوتوی کی تصانیف میں جابجا آپ کے محدثانہ ذوق اور رسوخ فی العلم کی جھلکیاں ملتی

ہیں، آخر کچھ تو بات تھی کہ تحشیۂ بخاری کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی، حضرت حجۃ الاسلام کے تئیں مذکورہ بالا شہادتوں اور ان کی علمی وتحریری خدمات کا اگر تجزیہ کر کے نتیجہ نکالا جائے تو کچھ یوں خلاصہ نکلتا ہے کہ آپ کے علم میں وسعت سے کہیں زیادہ ''عمق'' اور کمیت سے زیادہ ''کیفیت'' ہے، اگر چہ ان کی تصانیف کے صفحات کی تعداد کم ہو؛ لیکن علوم ومعارف کا جو فیضان ہے ان کے لیے صفحات ناکافی ہیں، ان تصانیف کی زبان اگر چہ عربی نہیں ہے؛ لیکن انداز ایسا کہ علماء یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ان کے علوم ومعارف کسبی کم، وہبی زیادہ تھے اور تواضع، کسرِ نفسی اور للّٰہیت وخلوص کی مثال آپ تھے، حضرت حجۃ الاسلام کی وفات پر سرسید (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے جو تعزیتی تحریر لکھی تھی اس کا ایک پیرا گراف بہ طور دلیل کے پڑھیے:

> ''اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اِس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو؛ اِلّا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے''۔(۷)

یہ چند اقتباسات اِس لیے گوارہ کیے گئے؛ تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ معقولات ومحسوسات کا فن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر کس وناکس اس میں طبع آزمائی کرسکتا ہے؛ بلکہ عقلیات کے فن کے لیے - سچی بات یہ ہے کہ - جملہ اسلامی علوم وفنون پر مکمل دسترس کا ہونا امرِ ناگزیر ہے ورنہ بجائے عقل کو دین کے تابع کرنے کے، انسان دین کو عقل کے تابع بنا سکتا ہے، جس میں گمراہی کے خطرات یقینی ہیں، حضرت حجۃ الاسلام سے قدرت نے اول الذکر کام لیا جس کی وجہ سے انھیں جملہ علوم وفنون سے نوازا گیا اور عقلی اعتراضات کے جو جوابات امت کے سامنے آئے، وہ اِس بات کے غماز ہیں کہ ان کا علم خداداد تھا، حاضر جوابی آپ کی فطرت کا حصہ تھی، علمِ کلام تو جیسے آپ کا خانہ زاد تھا؛ اسی صلاحیت کی وجہ سے حضرت اپنا نقطۂ نگاہ مثالوں سے اتنا واضح فرمادیتے تھے کہ اہلِ علم کے علاوہ عوام وخواص بھی جوابات کی اہمیت اور اس کے وزن کو سمجھ جاتے تھے؛ چوں کہ تمثیلات روزمرہ کی زندگی کے حالات وکوائف سے پیش کی جاتی تھیں؛ اِس لیے ہر شخص کو اسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا۔

مولانا نظام الدین اسیر ادروی لکھتے ہیں:

''دشمنانِ اسلام: عیسائی اور آریہ نے جو جارحانہ اندازِ بیان اختیار کررکھا تھا، ان کا جواب وہی عالم بہتر طور پر دے سکتا تھا جو علمِ کلام سے خوب واقف ہو، خود حضرت نانوتوی نے اِسی حربہ سے کام لے کر ادیانِ باطلہ کے بڑے بڑے مدعیانِ علم وفن کے ایسے پرخچے اڑائے کہ دوبارہ آپ کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی، واقعات اس کے شاہد ہیں''۔(۸)

اعتراضات وجوابات کی جھلکیاں

مذکورہ تمہیدات وتفصیلات کے بعد چند عقلی اعتراضات اور حضرت حجۃ الاسلام کی طرف سے دیے گئے جوابات کا تذکرہ مناسب ہے؛ تاکہ بصیرت کے ساتھ ان جوابات کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکے۔

(۱) گوشت خوری سے متعلق اعتراضات

(الف) ہندوؤں کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کو بوٹی بوٹی کاٹنا ظلم ہے وہ اسے ''جیوہتیا'' (جان مارنا) کہتے تھے، حضرت حجۃ الاسلام نے اس کے جواب میں ''تحفۂ لحمیہ'' نامی ایک مختصر؛ مگر جامع رسالہ لکھا اور عام فہم زبان میں یہ ثابت کیا کہ اسلامی طریقۂ ذبح ظلم نہیں ہے، اگر جانوروں کا ذبح کرنا ظلم ہوتا تو ساری دنیا میں گوشت خوری عام نہ ہوتی، صرف ایک ہندو قوم کے کہنے سے یہ ظلم نہیں ہوسکتا اور اگر ذبح کرکے گوشت کھانا ظلم ہے تو جانوروں کی کھال کا جوتا پہننا، ان کی ہڈیاں اور دیگر اجزا کا استعمال کرنا، جانوروں کو باندھ کر رکھنا، ان پر سواری کرنا، بوجھ لادنا، سرکشی کرنے پر مارنا، اس سے بڑا ظلم ہے، پھر حضرت حجۃ الاسلام نے عوام کی زبان میں محسوس طریقہ پر سمجھایا:

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ کسی ادنیٰ سے نوکر کو کچھ میٹھائی یا روٹی وغیرہ عنایت کرے اور فرمائے کہ کھاؤ اور وہ بایں خیال کہ اگر کھاؤں گا تو یہ بادشاہ کی چیز ہے، اس کی ہیئت بگڑ جائے گی، ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ ہوکر خراب ہوجائے گی اور پیٹ میں جاکر کچھ کا کچھ بن جائے گا، انکار کردے اور نہ کھائے اور غنیمت سمجھ کر سر اور آنکھوں پر نہ دھرے؛ بلکہ الٹا پھیر دے تو اس بادشاہ کو کیا اچھا معلوم ہوگا؟(۹)

(ب) آریوں کا ایک اعتراض جانوروں کی حلت وحرمت کے سلسلہ میں تھا کہ اگر جانور دعا پڑھنے سے حلال ہوجاتے ہیں تو سب جانور حلال ہوسکتے ہیں اور اگر دعا پڑھنے سے حلال نہیں ہوتے

تو خود مرا ہوا جانور کیوں حلال نہیں سمجھتے مردہ جانوروں کو بھی کھانا چاہیے؟

حضرت حجۃ الاسلام نے پہلے اعتراض کو انھیں پر پلٹ دیا اور فرمایا: خلاصہ درجِ ذیل ہے:

''مہا بھارت کی فصل سوم میں جو مرقوم ہے کہ جن جانوروں کے قتل کے وقت وید پڑھا جائے تو ان کا گوشت پاک ہے اور وہ انھیں لوگوں میں داخل ہے جس نے حیوانات کو ترک کر دیا اور جن حیوانات کے قتل کے وقت وید نہ پڑھا جائے تو وہ روا نہیں، پنڈت جی بتائیں اگر وید کی وجہ سے یہ وصف ہے تو سب ہی جانور حلال ہو سکتے ہیں اور اگر وید کی وجہ سے یہ وصف نہیں تو مردار کو حلال کیوں نہیں سمجھتے''؟

حضرت حجۃ الاسلام نے دوسری شق کا جواب یوں دیا، الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ خلاصہ پڑھیے:

''ہماری شریعت میں ذبح کے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ بالذات مؤثر ہے جیسے سورج آئینہ کو روشن کر دیتا ہے، اگر آفتاب نہ ہو تو آئینہ روشن نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے سورج مؤثِّر اور آئینہ متأثَّر، اسی طرح اللہ کا ذکر بوقتِ ذبح مؤثِّر ہے اور جانور متأثَّر ہوتا ہے، اگر مؤثِّر نہ پایا جائے یا متأثَّر میں تاثُّر کی صلاحیت نہیں ہے تو جانور حلال نہیں ہوسکتا، مردار جانور حرام ہوتا ہے اور حرام جانوروں میں متأثَّر ہونے کی صلاحیت نہیں؛ اِس لیے وہ حرام ہی رہتا ہے، دعا پڑھنے سے حلال نہیں ہوسکتا''۔(۱۰)

(ج) ایک مرتبہ پنڈت دیانند سرسوتی نے یہ کہا کہ گوشت کے اعتبار سے سارے جانور برابر ہیں جیسے گائے کا گوشت حلال ہے ویسے ہی خنزیر کا گوشت بھی حلال ہونا چاہیے اور اس نے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے ایک شعر پڑھا۔

''ماس ماس برابر جیسی گائے ویسی سور''

اِس کے جواب میں عموماً یہ لکھا جاتا ہے اور خود حضرت حجۃ الاسلام نے ''تحفۂ لحمیہ'' میں لکھا بھی ہے کہ ناپاک جانوروں میں ان کی جبلی خصوصیات کا اثر ہوتا ہے، جو لوگ خنزیر کھاتے ہیں ان میں خنزیر ہی جیسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں؛ لیکن حضرت حجۃ الاسلام نے مذکورہ شعر کا برجستہ شعر پڑھ کر جواب دیا اور سب کو لاجواب کر دیا فرمایا:

''عورت عورت برابر جیسی بیوی ویسی مادر''

یعنی اگر یہی فلسفہ ہے تو گھر کی عورتوں میں ماں، بہن اور بیوی کا فرق کیوں ہے؛ جب کہ سب برابر ہیں۔(۱۱)

(۲) کیا استقبالِ قبلہ، قبلہ کی پرستش ہے؟

آریوں کا مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی بُت پرست قوم مسلمان ہیں؛ کیوں کہ دنیا کے سارے مسلمان خانۂ کعبہ کی پرستش کرتے ہیں اور اسی کے سامنے سجدہ کرتے ہیں؟

حضرت حجۃ الاسلام نے اِس اعتراض کے جواب میں ''قبلہ نما'' نامی پوری کتاب لکھی، مولانا اسیر ادرویؒ نے اس کے متعلق لکھا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری بحث عام کتابی علم کی محدود روشنی میں ممکن ہی نہیں، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے قلب پر فیضانِ علمِ الٰہی کا ترشح ہو رہا ہے اور وہ آنکھیں بند کیے ہوئے سارے حقائق کو دیکھ رہے ہیں، قلم، الفاظ وحروف کے نقوش بنانے میں مصروف ہے، خود حضرت نانوتوی کو بھی اس کا احساس تھا کہ یہ بلند مضامین فہمِ انسانی کی قوتِ گرفت سے کچھ زیادہ ہی بلند ہیں''۔(۱۲)

مذکورہ کتاب سے چند جوابات نقل کیے جاتے ہیں:

۱- دنیا جانتی ہے کہ مسلمان کعبہ کو بیت اللہ یعنی خدا کا گھر کہتے ہیں، کعبہ کو خدا نہیں کہتے، جب کوئی کسی کے گھر جاتا ہے تو مکان سے ملتے نہیں جاتا؛ بلکہ مکین سے ملنے جاتا ہے، اسی سے سلام کلام کرتا ہے، بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں تو شاہی محل کو سلام نہیں کرتے، بادشاہ کے سامنے جھکتے ہیں، زمین پر سجدہ ریز ہوجاتے ہیں؛ کیوں کہ بادشاہ ہی کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے، مسلمان بھی کعبہ نہیں، ربِ کعبہ کے سامنے جھکتا ہے، اسی کو سجدہ کرتا ہے اور ہندو تو اپنے بتوں کو خانۂ خدا بھی نہیں کہتے اور نہ سمجھتے ہیں؛ بلکہ اسی بت کو خدا کہتے ہیں۔

۲- اگر مسلمانوں کی عبادتوں میں کعبہ پرستی ہوتی تو جیسے بُت پرستی کے وقت بتوں کا سامنے ہونا ضروری ہے ویسے ہی دیوارِ کعبہ کا سامنے ہونا بھی ضروری ہوتا؛ حال آں کہ ادائے نماز وحج کے لیے دیواروں کا ہونا شرط نہیں ہے۔

۳- اہلِ اسلام کعبہ کو اپنے حق میں مختارِ نفع وضرر نہیں سمجھتے؛ بلکہ حضرت محمد رسول اللہ کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں، آپ ﷺ کے برابر نہ کوئی انسان ہوسکتا ہے، نہ فرشتہ، نہ عرش اور نہ کرسی، اس کے باوجود مسلمان حضور ﷺ کی پرستش نہیں کرتے، اگر اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا ہوتی تو حضور ﷺ کی ہوتی، جب مسلمانوں نے ان کو بھی عبد ہی مانا معبود نہیں مانا تو خانۂ کعبہ کو اپنا معبود کیسے مان سکتے ہیں؛ جب کہ وہ حضور ﷺ سے افضل بھی نہیں ہے اور بُت پرست تو اپنے معبودوں کو مختارِ نفع وضرر اور

عابدوں سے افضل سمجھتے ہیں۔ (۱۳)

یہ چند جوابات بہ طور مثال کے تھے، ورنہ حضرت نے استقبالِ قبلہ کے سلسلے میں جو متکلمانہ گفتگو کی ہے، معبود اور تجلی گاہِ معبود کو سمجھایا ہے؛ وہ آپ ہی کا حصہ ہے، مولانا اسیر ادروی نے لکھا ہے:

''اِس جواب میں آپ کے بحرِ علم کی طغیانی وتموج کا مشاہدہ ہوتا ہے، سیکڑوں تمثیلات، مشاہدات وتجربات، حقائقِ زندگی، روزمرہ کے واقعات کے شواہد سے اس کی وضاحت پھر اس کے نتائج، پھر ان سے استدلالات کا ایک طوفان خیز سیلاب ہے جو ۶۰ صفحات تک پھیلتا چلا گیا ہے، اصل بحث کتاب ہی میں دیکھی جاسکتی ہے، اس کی تلخیص اس لیے مشکل ہے کہ ترتیبِ مقدمات اگر کئی صفحات تک چلی گئی ہے تو اس سے نتائج کی تفصیل کے لیے بیسیوں صفحات ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے سمجھایا نہیں جاسکتا''۔ (۱۴)

(باقی اگلے ماہ)

❁ ❁ ❁

حوالہ جات

(۱) حکمتِ قاسمیہ قاری محمد طیب صاحبؒ، ص:۲۴-۱، شعبۂ نشر واشاعت دارالعلوم دیوبند
(۲) حضرت نانوتوی اور خدماتِ ختمِ نبوت، مولانا محمد سیف الرحمٰن قاسم، ناشر: جامعۃ الطیبات للبنات الصالحات، گوجرانوالہ، ص: ۲۵
(۳) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے، مولانا اسیر ادروی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند، ص:۱۵۹، سن اشاعت: ۱۹۹۵ء
(۴) سفینۂ رحمانی، حافظ عبدالرحمٰنؒ، ص:۱۱۹، مطبع نول کشور لکھنؤ، سن اشاعت: ۱۸۸۴ء
(۵) حدائق الحنفیہ، مولانا فقیر محمد جہلمی، ص:۴۹۲، مطبع نول کشور لکھنؤ، سن تالیف: ۱۸۸۰ء
(۶) قاسم العلوم والخیرات، سید نفیس الحسینی، ص:۵، ناشر: سید احمد شہید اکادیمی لاہور بحوالہ انوار العاشقین، ص:۸۷
(۷) موجِ کوثر، شیخ محمد اکرام، ص:۳۶۷، ادبی دنیا ٹیا محل دہلی (۱۹۹۱ء)
(۸) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے، ص:۱۵۹، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند
(۹) تحفۂ لحمیہ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص:۸، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند
(۱۰) انتصار الاسلام، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۸۳، تسہیل: مولانا اشتیاق احمدؒ، شعبۂ نشر واشاعت دارالعلوم دیوبند ۱۹۸۸ء
(۱۱) الامام محمد قاسم نانوتوی، حیات، افکار، خدمات، ص:۸ باہتمام: تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی ۲۰۰۵ء
(۱۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۴۰۵
(۱۳) اختصار: قبلہ نما، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۲۴۶، تسہیل: مولانا اشتیاق احمدؒ، مکتبہ دارالعلوم دیوبند ۲۰۱۳ء
(۱۴) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۴۰۴، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند

❁ ❁ ❁

حضرت محمد ﷺ کی سیاسی دستاویزات انسانی حقوق کی علمبردار

(۲)

از: ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی
پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، شعبہ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

احترامِ آدمیت

اورتم سب، عنقریب رب ذوالجلال کے پاس جاؤگے؛ پس وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا(۲۴)۔

ان ارشاداتِ ختم المرسلین پر غور کیجیے اور ایک مرتبہ پھر اس وقت، اس زمانہ کا تصور کر لیجیے؛ جب کہ حقوق ومساوات انسانی کا یہ سبق، احترامِ آدمیت کا یہ فرمان اور تکریمِ انسانیت کا یہ اعلان یا مختصر الفاظ میں یہ منشورِ انسانیت سرورِ عالم ﷺ کی طرف سے جاری کیا جارہا تھا، اور اسے تمدن ومعاشرت انسانی کا لازمہ قرار دیا جارہا تھا، تاریخ بتاتی ہے کہ اس ''منشور انسانیت کا اجراء آج سے کوئی ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس وقت روبہ عمل آرہا تھا؛ جب کہ دنیا میں کہیں حقوق انسانی کا کوئی یقین کوئی تصور موجود نہ تھا(۲۵)۔ انسانی مساوات کے الفاظ لغتِ اقوام میں سراسر اجنبی تھے(۲۶) اور تمدن ومعاشرتِ باہمی کے لیے احترامِ آدمیت اور حقوقِ انسانی کی اہمیت سے یونان وروم، عجم وعرب سے سب ہی ناواقف تھے۔

علاوہ ازیں ان حقوقِ انسانی کا اجراء جس ذاتِ بابرکت کے ہاتھوں ہورہا تھا، وہ نہ صرف یہ کہ اوجِ رسالت پر فائز اور صفات وکمالاتِ نبوت سے آراستہ تھی؛ بلکہ وہی ہستی امر واقع میں جزیرہ نمائے عرب کی مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز تھی، اور ان حقوق وفرامین کے اجرا کی سند اُسے مقتدرِ اعلیٰ کی طرف سے ملی تھی اور ان کی آخری منظوری احکم الحاکمین کے ایوانِ اختیار سے جاری کی جاچکی تھی۔ گویا سیاسی لغت کے حوالے سے یہ منشورِ انسانیت ایک وسیع الاختیار مملکت اور کثیر الوسائل ریاست کی

طرف سے عطا کیے جارہے تھے اور دینی، اخلاقی حوالے سے یہ ربُ الناس (انسانوں کے پالن ہار) اور ملکُ الناس (انسانوں کے بادشاہ) کی عطائے خاص تھی جو حاضر وغائب تمام انسانوں تک بالواسطہ پہنچائی جارہی تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ارشاداتِ سیدلولاک ﷺ میں انسانیت کو جن حقوق وتحفظات سے سرفراز کیا جارہا تھا، اور احترامِ آدمیت وانسانیت کے جو اصول زبانِ رسالت مآب ﷺ پر جاری ہوئے، آنے والے زمانوں میں ان ہی کی روشنی وتابانی سے افق تاافق اجالا ہوا اور دنیا میں جہاں کہیں بھی بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور انسانی معاشرے میں جہاں کہیں بھی آزادی، مساوات اور حقوق کی آواز بلند ہوئی، اس کے پیچھے یہی آواز تھی جو اس وقت وادیِ فاران میں گونج رہی تھی۔

پیغمبر انسانیت ﷺ نے اپنی ان دستاویزات میں جن بنیادی انسانی حقوق اور تحفظات کو معاشرے ومساواتِ انسانی کے لیے لازم ٹھہرایا (اور جن میں سرفہرست، تحفظ جان، تحفظ مال وملکیت، تحفظِ عزت وآبرو، حقِ انصاف ومساوات، اور فرق وامتیاز کے بغیر انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک اور دیگر معاشرتی حقوق و مسائل شامل ہیں(۲۷)۔ان کی نوعیت یہ ہے کہ) وہ تمام تر ایجابی (POSITIVE) اور واقعی (REAL) حیثیت رکھتے ہیں۔ان کو عوام کی طفل تسلی کے لیے خطابت کے زور پر، کاغذی پیرہن میں، وقتی حل کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔نہ وہ ترحم خسروانہ کا عکس نہ تھے؛ بلکہ ان کے پیچھے اسلام کی مستقل تعلیمات، قرآن کی ابدی آفاقی ہدایات اور ریاست نبوی ﷺ کی تابندہ روایات جلوہ گر تھیں، ان حقوق کو عملاً برت کر دکھایا جاچکا تھا اور ایسے تحفظات، اس ریاست، اس معاشرے میں فراہم کیے جاچکے تھے جو اجرائے حقوقِ انسانی اور تشریف وتکریمِ آدمیت کی بجائے خود ضمانت تھے۔ذیل میں رسول اللہ ﷺ کی ان دستاویزات کا جائزہ لیا جارہا ہے جن کا تعلق قرامین ومعاہدات سے ہے۔

انسانی اور آفاقی پہلوؤں اور متعلقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ محسن انسانیت، رہبر آدمیت، سرورکونین ﷺ کی تاریخی دستاویزات الفاظ کے پیراہن میں کتنے ہی چمن زادِ معانی رکھتی ہوں، جن کی نکہتوں نے پورے عالم کو معطر کردیا تھا اور چمن انسانیت میں جس کی خوشبو آج تک پھیلی ہوئی ہے۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی دستاویزات کے بہت سے روشن پہلوؤں میں سے روشن تر پہلو اور نمایاں ترین وصف ان کا انسانی پہلو اور ان کی ہمہ گیریت وآفاقیت ہے، اس بات کا اندازہ

نہ صرف یہ کہ ان کے مضمون اور ان کے محل وقوع سے ہوجاتا ہے؛ بلکہ اس کا صاف قرینہ یہ بھی ہے کہ چوں کہ پیغمبر انسانیت ﷺ کی بعثت مبارکہ تمام عالم کے لیے، تمام زمینوں کے اور تمام زمانوں کے لیے ہوئی، نیز آپ پر ایک عالمی آفاقی کتاب ہدایت کا نزول ہوا، اور آپ کی دعوت وتبلیغ کا منتہی، آپ کا لایا ہوا پیغام اور آپ ﷺ کا مشن بھی عالمی انسانی آفاقی نوعیت کا تھا؛ اس لیے ایسے ہمہ صفت، ہمہ جہت رسول ﷺ کی رسالت کا اظہار اور ہادیِ عالم کی عالمگیر نبوت کا مقتضا بھی دراصل، ایسے خطاب اور معاہدات ودستاویزات کی صورت میں ہی موزوں ہوسکتا تھا۔ جس کے آئینہ میں ہر زمانہ اپنی تصویر دیکھ لے اور جان لے کہ اس دائمی منشور انسانیت کی رو سے، وہ شرف آدمیت وانسانیت کی کون سی منزل میں ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی ان دستاویزات کا انسانی اور آفاقی پہلوؤں کی معنویت واہمیت کا جائزہ اپنے زمانے اور تاریخی پس منظر کے حوالے سے راقم پچھلے صفحات میں کرچکا ہے؛ لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کی اہمیت اپنے پس منظر کے حوالے سے فزوں تر ہوجاتی ہے؛ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ رسالت کے بعد بھی عرصۂ دراز تک یہی انسانی اور آفاقی اقدار اسلامی معاشرہ کی روح رواں بنی رہی ہیں، جن کی ترجمانی اس منشور انسانیت میں کی گئی تھی؛ بلکہ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ تصور نہ کیا جائے گا کہ آزادی وحقوقِ انسانی کا جو پروانہ سرکارِ رسالت مآب ﷺ کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔ اس نے خاکی انسانوں میں جرأت وہمت، اور آزادی وبے باکی کے ایسے شرارے بھر دیئے تھے کہ جس کے سبب ان کی گردن کٹ تو سکتی تھی؛ مگر جھک نہیں سکتی تھی، پھر جب اسلامی اقتدار حدودِ عرب سے نکل کر شمال میں آگے بڑھا اور مشرق ومغرب کی وسعتوں پر چھاتا چلا گیا تو حقوقِ انسانی کی سوغات اور آزادیوں کا توشہ دوسری اقوام وملل کو بھی ملا اور یوں جہاں جہاں شرفِ آدمیت کے چراغ روشن ہوئے اور احترام وحقوقِ انسانی کے لیے آواز بلند کی گئی، اس کا سرچشمہ اسی منشورِ انسانیت میں پنہاں ہے۔

آج ہم جس عہد میں زندگی گذار رہے ہیں، بہ ظاہر اس کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرسکتی ہے؛ لیکن بہ نظر غائر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ظرف اور زماں کی ہزار تبدیلیوں کے باوجود ''انسانیت'' دم بہ دم خیر وفلاح سے محروم ہوتی چلی جارہی ہے، اقصائے عالم میں رفتہ رفتہ ایک عالمگیر جاہلیت، کا اثر ونفوذ بڑھتا چلا جارہا ہے بہ قول ایک مصنف انسانوں نے پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا، مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا سیکھ لیا؛ لیکن آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا بھول گئے۔ اخلاق ومعنویات

اورحقیقی انسانی صفات وکمالات میں سخت انحطاط اورتنزل ہوا،غرض لوہے اوردھات کو ہرطرح ترقی ہوئی اور ''آدمیت'' کو ہرطرح زوال ہوا۔قوم ہو یا فرد آج ہرایک کمزوروں سے طاقت کی وہی زبان استعمال کررہاہے اورقوت کی وہی دلیل آگے لارہاہے۔جوکبھی عہد جہالت کا طغرائے امتیاز تھا، انسانی حقوق کی پامالی اورآزادیوں کی غلامی کے ہزارعنوان قائم ہوگئے ہیں،شیطنت وبہیمیت کاصحرا پھیلتا چلاجارہاہے۔اورشرفِ آدمیت وانسانیت کے چھوٹے چھوٹے نخلستان باقی رہ گئے ہیں؛ بلکہ آج بھی غیراللہ کی عبادت وطاقت کابازارگرم ہے،آج بھی خواہشاتِ نفس کا بگل برسرراہ بج رہاہے ﷺ آج عالمِ انسانیت اپنی وسعت، وسائل سفرکی فراوانی،نقل وحرکت کی آسانی اوراقوام ومما لک کے قرب واتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے۔اس وقت کامادہ پرست انسان اس دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کوتسلیم نہیں کرتا اوراپنے فوائداورخواہشاتِ نفس اورخود پرستی کے سوااس کوکسی چیز سے دلچسپی نہیں۔

خودغرضی نے اس کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں دوآدمی بھی زندہ رہ سکیں،تنگ نظروطن پرستی ہرایسے انسان کوجواس کے وطن کے باہر پیدا ہوجانے کاقصوروار ہے،نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے،اس کے ہرکمال کی منکر ہےاوراس کو ہرحق سے محروم کرتی ہے۔انسانی معاشروں میں جاہلیت کے آثارومفاخرنے پھرسے جنم لےلیا ہے،امنِ عالم کو پہلے سے زیادہ خطرہ درپیش ہے،استعماریت،طبقاتی کشمکش،نسلی اورقومی امتیازات نے خشکی وتری ہرجگہ فساد بپا کررکھا ہے،اوربحیثیت مجموعی،قبائے انسانیت گردآلود ہوگئی ہے۔ایسے عالم میں پھرسے ضرورت ہے کہ ''اس صوتِ ہادی'' کوسناجائے جس نے کوئی ڈیڑھ ہزار برس پہلے کایاپلٹ دی تھی۔کیا عجب منشورِ انسانیت کے ان چندفقروں کی دیانت دارانہ تعمیل سے ہی عالمِ انسانیت کتنی ہی لعنتوں سے نجات پاجائے اوراس شاہراہِ حیات پرگامزن ہوجائے جودین ودنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

بہرحال حضوراکرم رحمتِ عالم ﷺ کی دستاویزات تھیں جسے عالمی انسانی منشورقرار دیاجانا مناسب ہے، یہ اپنی مستقل حیثیت، اہمیت وافادیت رکھتی ہیں،باعث اجروبرکت اور ہرلحاظ سے قابل توجہ اورقابلِ عمل ہیں،ان کامتن، مواداورمضامین سرتاسرالہامی ہیں (وماینطق عن الھویٰ ان ھوالاوحیٌ یُّوحیٰ) کیونکہ یہ خودکلامِ نبوت ہیں۔دوسرے یہ کہ قرآنی تعلیمات اوراحادیثِ رسالت مآب سے وابستہ ہیں۔یہ دستاویزات حاکمانہ بصیرت وتجربات سے مستفاد ہیں۔

اس دفعہ ۴۷/کا تقاضہ یہ تھا کہ حاضر سے غائب تک سامعین کی وساطت سے منتقل ہوتا چلاجائے

اور جو اسے سنتا جائے، دوسروں تک پہنچاتا چلا جائے (**بلغوا عنی ولو آیة**) بہ ظاہر یہ سادہ سی ہدایت تھی؛ لیکن اس میں گویا ابلاغِ عامہ کے عمودی رخ کی تمام وسعتیں پنہاں تھیں؛ جب کہ دوسری شق میں (یہ فرما کر کہ) قریب والوں پر لازم ہے کہ دور والوں تک یہی پیغام پہنچاتے رہیں، یہ گویا افقی طرزِ ابلاغ ہے؛ چنانچہ قاعدے کے مطابق اگر نجوم ہدایت لیے یہی ابلاغی لہریں واسطہ در واسطہ عمودی اور افقی دونوں سمتوں میں حرکت پذیر رہیں تو پورے کرۂ وجود پر اجالا پھیل جاتا ہے، ضمناً یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ حضور ﷺ اجالے پھیلانے، روشن کو روشن تر کرنے آئے تھے، **قد جاءکم من اللّٰہ نورٌ و کتابٌ مبین** (سورۂ مائدہ، آیت ۱۵) اور یہ بھی گویا آپ ﷺ کے فرض منصبی میں داخل تھا کہ عوام الناس کو مقام آشنا، حقوق آشنا کر کے ظلمتوں سے نکال کر روشنی کی دہلیز پر لے آئیں۔ **لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظلماتِ إلَی النُّور** (سورۂ ابراہیم، آیت ۱) اس لیے آپ ﷺ کے ہر امتی کا یہ فرض منصبی ٹھہرا کہ آپ ﷺ کے آفتابِ ہدایت وارشاد سے ایک ایک کرن مستعار لے کر ہر ایک کے لباس وجود میں ٹانک دے؛ تاکہ آج وفورِ معلومات کے باوجود افکار میں جو تیرگی بڑھ گئی ہے اسے روشنی نصیب ہو۔ تسلسل ابلاغ کی جو ذمے داری ہر مسلمان (فرد وجماعت) پر عائد ہوتی ہے، اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی ان دستاویزات کو ہر ممکن طریقہ سے دوسروں تک پہنچایا جائے؛ تاکہ جو سلسلہ غیر منقطع صدیوں سے جاری ہے اس میں خلل واقع نہ ہو۔

❁ ❁ ❁

مراجع وحواشی:

(۲۴) ابن ہشام، ج۴، ص: ۲۵۰

(۲۵) صلاح الدین، بنیادی حقوق، ص: ۳۷/ تا ۴۶ میں تفصیل دیکھئے۔

(۲۶) ایضاً، ص: ۲۸

❁ ❁ ❁

نام رکھنے کا اسلامی نظام

(۱)

از: مولانا ارشاد احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم سوپور، کشمیر

''نام''، کسی بھی چیز کے لیے ایک تعارفی علامت ہے جس کی اہمیت فطری بھی ہے اور معاشرتی بھی۔ ناموں کی اہمیت وافادیت سے کسی مذہب وملت کو انکار نہیں۔ اسلام نے اس موضوع کو اور نمایاں کیا؛ چنانچہ اسلام نے جس خصوصیت اور اہمیت سے اس پہلو کی جانب توجہ دلائی، کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ ناموں کے حوالے سے کتبِ احادیث وفقہ میں معتد بہ مواد دستیاب ہے۔ محدثین و فقہاء نے موضوع کے اہم ہونے کے پیش نظر اس کے لیے الگ ابواب وعنوانات قائم کیے ہیں؛ کیونکہ نام تعارفی علامت کے ساتھ ساتھ، انسان کے دین وعقیدہ کا مظہر اور اس کے مسلک ومشرب کا ایک نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اسے شعار کا درجہ حاصل ہے؛ جس کی وجہ سے آدمی باطل مذاہب ومسالک سے ممتاز ہوجاتا ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ سے اسلامی نام کو ایک بیش قیمت نعمت کا درجہ حاصل ہے۔ حضرتِ آدم علیہ السلام کو جب اس دنیا میں اتارا گیا، تو فرشتوں نے انسان کی فطری کمزوریوں کو دیکھ کر اپنے پروردگار سے کہا: ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ '' کیا آپ ایسی ہستی کو خلیفہ بنارہے ہیں جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خوں ریزی کرے گی؟'' (البقرۃ: ۳۰)۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُم صادقين﴾ ان حقیقتوں کے نام بتلاؤ اگر تم درستی پر ہو (البقرۃ: ۳۱)۔ ابن عطاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ناموں کے ذریعے ہی فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کا شرف ظاہر فرمایا اور یہ بات واضح ہے (قرطبی: ۱/۱٤٦)۔ اسی طرح اللہ رب العزت نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ایک فضیلت نام سے ثابت فرمائی: ﴿لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ ''یعنی یحییٰ سے پہلے کوئی بھی اس کے نام کا شریک نہ تھا (بلکہ یہ ان کا خصوصی اور امتیازی نام ہے)''۔ اس سے معلوم ہوا کہ نام شریعت میں عظیم نعمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی، اسلام کی جانب سے والدین پر جو

حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ بچے کے اچھے نام کی جانب توجہ کریں اور یہ ایسا حق ہے جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہمیں اس واقعہ سے ہوگا کہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے پاس ایک آدمی اپنے بیٹے کی شکایت لے کر آیا کہ نافرمان ہو چکا ہے تو حضرت عمرؓ نے اسے حاضر کیا اور کہا کہ تم اللہ سے ڈرتے نہیں؟ اپنے والد کی نافرمانی کرتے ہو؟ والد کے حقوق پہچانتے نہیں؟ تو اس لڑکے نے حضرت عمرؓ سے کہا: اے امیر المؤمنین! کیا بیٹے کا اپنے باپ پر کوئی حق ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''نَعَمْ، حَقُّهُ عَلَيْهِ أنْ يَسْتَنْجِبَ أمَهُ، وَيُحْسِنَ اسْمَهُ وَيُعَلِّمَهُ الْكِتَابَ'' (جی بالکل، باپ پر بیٹے کے کئی حقوق ہیں، وہ یہ ہیں باپ بچے کے لیے اچھی ماں تلاش کرے، اچھا نام رکھے اور کتاب اللہ کی تعلیم دے)۔ تو بیٹے نے کہا: ''فَوَاللّٰهِ مَا اسْتَنْجَبَ أُمِّيْ وَمَا هِيَ إلَّا سَنَدِيَهِ اشْتَرَاهَا بِأَرْبَعِ مِائَةِ دِرْهَمٍ، وَلَاحَسَّنَ اسْمِيْ، سَمَّانِيْ جُعَلًا، وَلَا عَلَّمَنِيْ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ آيَةً وَاحِدَةً'' (بخدا نہ میرے لیے اچھی ماں کا انتخاب کیا۔ میری ماں ایک سندیہ باندی ہے، جسے اس نے چار سو درہم میں خریدا۔ میرا نام ''جُعَل (یعنی کالا بدصورت)'' رکھا جو اچھا نام نہیں اور نہ مجھے قرآن کی کوئی آیت سکھائی)۔ تو حضرت عمرؓ اس کے باپ کی جانب متوجہ ہوا اور کہا: تیرا دعوی ہے کہ تیرا بیٹا تیرا نافرمان ہے اور تیری حق تلفی کرتا ہے؟!!، تو نے تو پہلے ہی اس کے حقوق دبا لیے ہیں۔ پھر سخت لہجے میں اس سے کہا: قُمْ عَنِّيْ ''یہاں سے بھاگ'' (تنبیه الغافلین: ٤٦ عن موسوعه الأسره: ٤/ ١٣١)۔ اس سے نام کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا کہ کتنا نازک معاملہ ہے، خلیفۃ المومنین نے اس حق تلفی کی بنا پر اس کے باپ کی تمام شکایتوں کو کالعدم قرار دیا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَ أَدَّبَهُ ''جس کا کوئی بچہ پیدا ہو تو اس کا خوب صورت نام رکھے اور اچھا ادب سکھائے'' (بیهقی: ٨١٤٥)۔ علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں: اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ نام رکھنا واجب اور ضروری ہے (مراتب الاجماع: ٢٤٩)۔ علامہ ماوردی لکھتے ہیں: فَإذَا وُلِدَ الْمَوْلُوْدُ، فَإنَّ مِنْ أوَّلِ كَرَامَاتِهِ لَهُ وَ بِرِّهِ بِهِ أنْ يُحَلِّيَهِ بِاسْمِ حُسَنٍ الخ یعنی جب بچہ پیدا ہو تو اس کے ساتھ پہلا حسن سلوک یہ ہے کہ اس کا نام اچھا رکھا جائے (تحفة الملوك: ١٦٦)۔

عرب کا مزاج

تاریخ نے عرب معاشرے کے جن عیوب کا ذکر کیا ہے، ان میں شرک و بت پرستی، نخوت و تکبر بھی بڑے عیب سمجھے جاتے ہیں۔ ان عیوب کا اثر ان کے ناموں پر بھی تھا؛ چنانچہ وہ ایسے نام پسند کرتے تھے جن میں شرک و بت پرستی، فخر و ریا کا معنی موجود ہوتا اور فخر و ریا میں حدِ مبالغہ سے بھی بعض

لوگ حد سے آگے بڑھ گئے تھے۔ تاریخ میں موجود ہے کہ بعض عربوں کا مزاج تھا کہ اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کراتے تھے کہ باپ ہی اپنی بیٹی سے پیدا ہونے والے اولاد کا نام رکھے گا جیسا کہ عوف بن شیبانی کے سلسلے میں منقول ہے کہ اس نے اپنی بیٹی ام ایاس کا نکاح عمرو بن حجر سے کیا اور شرط یہ رکھی کی ام ایاس سے پیدا ہونے والی اولاد کا نام وہی رکھے گا۔ علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: ناموں کے سلسلے میں عربوں کے مزاج مختلف تھے۔ فطرتاً جنگ وجدال کی جانب مائل تھے، اسی لیے اپنی اولاد کا ایسا نام رکھتے جن کے معنی سے دشمن پر فتحیابی کا شگون لیا جاس کے، اس طرح وہ غالب، غَلَّاب (بہت غلبہ پانے والا)، مالک، ظالم، عارم (شدید)، مُنازل (لڑاکو)، مقاتل، مُسْہر (بے خواب و بے چین کرنے والا)، مُؤرِق (بے خواب و بے چین کرنے والا)، مصبح (قندیل یا فانوس) اور طارق (رات میں آنے والا) جیسے ناموں کو ترجیح دیتے تھے۔ بعض لوگ سلامتی سے شگون لیتے اور ایسے نام پسند کرتے جس میں حفاظت وسلامت اور سعادت مندی کا معنی پایا جاتا، اسی لیے سالم، ثابت، سعید، سعد، اسعد، مسعود جیسے ناموں کو اچھا سمجھتے تھے۔ بعضوں کی طبیعت تھی کہ نام کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے جن سے قوت وطاقت یا سختی کا کنایہ کیا جاتا۔ اس طرح وہ اسد (شیر)، لیث (شیر)، ذئب (لومڑی)، ضرغام (شیر)، حجر (پتھر)، صخر (چٹان)، فہر (پتھر)، جندل (ضخیم چٹان) جیسا نام رکھتے۔ مزاج میں اتنی آزادی اور لاپرواہی تھی، جس چیز کی جانب مائل ہوتے اسی کو ترجیح دیتے حتیٰ کہ بعض لوگوں کی طبیعت تھی کہ اس چیز کا نام بچے کے لیے منتخب کرتے جس کو وہ گھر سے نکلتے وقت دیکھتے (موسوعة الأسرة عن مفتاح دارالسعاده ملخصًا: ٤/ ١٢٧)۔ اسلام توحید کا دین ہے جو اللہ کے فضل وکمال ہی کا داعی ہے۔ ساتھ ساتھ امن وسلامتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر ونخوت وغیرہ سے بیزار ہے؛ اس لیے اس باب میں شریعت کی جانب سے ضروری وغیر ضروری ایسی اصلاحات عمل میں لائی گئیں جو اسلام کے شستہ وشائستہ معاشرہ کے ہم آہنگ ہیں؛ تاکہ ایک تاریک معاشرہ کے خاتمہ پر ایک روشن معاشرہ کا آفتاب طلوع ہو، جو توہم وشرک سے پاک ہو، صرف اور صرف صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) میں ڈھلا ہو۔

اچھا نام رکھنے کی ترغیب

نام کی حیثیت ایک قالب کی سی ہے جس میں انسان ڈھلتا ہے۔ نام کا انسان کی فطرت پر نفسیاتی اثر رہتا ہے۔ اچھے نام والا آدمی اپنے نام کا اچھا اثر محسوس کرتا ہے؛ چنانچہ جب اس سے پکارا جاتا تو وہ اپنے اندر ایک عجیب طرح کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اس کے برخلاف جس کا نام اچھا نہیں ہوتا تو وہ اپنے نفس کو جھنجوڑتا رہتا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ نے عجیب بات لکھی کہ ناموں کا یہ اثر انسان کی

شخصیت پر اتنا نمایاں ہے کہ مشاہدہ ہے کہ جتنی بڑی شخصیات دنیا میں تشریف فرما ہوئیں، ان کے نام بھی ان شخصیات کے مناسب تھے اور تاریخ میں جو لوگ منفی تشخص رکھتے ہیں، ان کا نام بھی ان کے موافق ملے گا، ان کا اچھا نام نہیں ملے گا (تحفة المودود: ۲۱۳)۔ حضرت عمرؓ کے پاس ایک آدمی آیا، آپ نے نام دریافت کیا تو اس نے کہا: میرا نام جمرہ (دھکتی آگ) ہے، پھر دریافت کیا کہ تیرا باپ کون؟ اس نے جواب دیا: شِھاب (آگ کا شعلہ)۔ پھر پوچھا کہ کس قبیلہ کا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: حُرقہ (گرمی اور جلن) قبیلے سے ہوں۔ حضرت عمرؓ نے سوال کیا کہ تیرا گھر کہاں ہے؟ اس نے کہا: حَرَّۃُ النار (آگ کا علاقہ) میں میرا گھر ہے۔ پھر پوچھا کہ یہ جگہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ذاتُ لظی (آگ والی) میں۔ حضرت عمرؓ نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ اور بددعا کے طور پر کہا کہ جاؤ تیرا خانہ ہی جل گیا، پھر جب وہ گیا اس نے اپنے گھر کو جلا ہوا پایا (زادالمعاد: ۳۰۸/۲، أوجز المسالك: ۳۳۹/۱۷)۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کبھی اپنے لیے خود کنواں کھود کر مصیبت کھڑی کرتا ہے؛ کیونکہ آدمی کو اپنے قول وفعل ہر چیز کا حساب اپنے رب کے پاس دینا ہے، اور اللہ کسی بھی چیز پر پکڑ کر سکتے ہیں۔ مومن ایسا ہونا چاہیے کہ اس کے قول وفعل سے خیر وصلاح ہی ٹپکے۔ گویا اس مذکورہ آدمی کا ایسے نام رکھنا شرعی قوانین پر نہیں تھا؛ یہی وجہ تھی کہ اللہ نے اس کا نتیجہ اس پر ظاہر فرمادیا۔ حدیث میں ہے: **كُلُّ كَلَامِ ابْنِ آدَمَ عَلَيْهِ لَا لَهُ إِلَّا أَمْرٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ نَهْيٌ عَنْ مُنْكَرٍ** یعنی ابن آدم کے (برے) کلام کا نقصان اس کو پہنچتا ہے؛ مگر یہ کہ وہ (خیر کا کلام ہو یعنی) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قبیل سے ہو (مشکوۃ: ۲۲۷۵)۔ دین اسلام خوب صورت ہے۔ پروردگار خوب صورت ہے۔ اس دین کے مبلغِ اول خوب صورت ہیں۔ تو شریعت برے ناموں کو پسند کیسے کرتی؟ حدیث میں ہے کہ بدشگونی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، آدمی کو چاہیے کہ نیک فال اختیار کرے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ نیک فال کیا ہے؟ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الكلمةُ الصالحةُ يَسْمَعُهَا أَحَدُكُمْ** یعنی آدمی کوئی صالح اور اچھا لفظ سنے (بخاری)۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے صرف خوب صورت ناموں کو جائز ہی نہیں کہا؛ بلکہ خوب صورت نام رکھنے کی ترغیب بھی دی اور ساتھ ساتھ اس کا رشتہ آخرت کے ساتھ بھی جوڑ دیا۔ حدیث میں ہے: **إِنَّكُمْ تَدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِأَسْمَائِكُمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِكُمْ فَأَحْسِنُوا أَسْمَائَكُمْ.** ''تم کو روزِ قیامت تمہارے اور تمہارے آباء کے ناموں سے پکارا جائے گا؛ اس لیے نام اچھے رکھو'' (أبوداؤد: ۴۹۴۸)۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کئی ایک موقعے پر ان لوگوں کو آگے رکھا جن کے نام اچھے تھے؛ تاکہ امت میں اچھا نام رکھنے کا رجحان پیدا ہو۔ ایک موقع پر دودھ دوہنے کی باری آئی تو اللہ کے رسول نے فرمایا: اس اونٹنی

کوکون دوہے گا؟ ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا: میں! حضور نے پوچھا: نام کیا ہے؟ اس نے کہا: ''مرہ (کڑوا)''۔ فرمایا: بیٹھ جا۔ پھر دوسرا کھڑا ہوا جس کا نام جمرہ (آگ کا شعلہ) تھا۔ تو اللہ کے نبی نے کہا: تو بھی بیٹھ جا۔ پھر ایک اور آدمی کھڑا ہوا جس کا نام ''یعیش'' تھا (زندگی گذارنے والا)''۔ تو اللہ کے نبی نے یہ کام اسی کے سپرد فرمایا (موسوعة الأسرة). صرف انسانوں کے لیے نہیں؛ بلکہ انسانوں کے ساتھ ساتھ شریعت نے مقامات کے صحیح ناموں کی جانب راہنمائی فرمائی۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز سے بدشگونی نہیں لیتے تھے۔ جب کسی عامل کو بھیجتے تو اس کا نام دریافت کرتے، اگر اس کا نام پسند آتا، تو خوش ہوتے اور اس کی خوشی آپ کے چہرے پر ظاہر ہوتی اور اگر نام پسند نہ آتا تو چہرے پر ناپسندیدگی ظاہر ہوتی۔ اگر کسی بستی میں جاتے تو اگر بستی کا نام پسند آتا تو خوشی کے آثار چہرۂ انور پر ظاہر ہوتے اور اگر نام پسند نہ آتا تو اس کی ناپسندیدگی ظاہر ہوتی (ابو داؤد: ۳۹۲۲)۔ یہ ایسی جامع اصلاحات ہیں جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ جاہلیت میں رائج تمام رسومات کو صحیح شفاف اسلامی رنگت حاصل ہو۔

محبوب ترین نام

اللہ معبود ہے اور انسان عابد، اللہ کو بندے کی صفت عبدیت بہت محبوب ہے، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ صفتِ عبدیت بندے کے ہر چیز سے ظاہر ہو۔ ناموں کے سلسلے میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس پہلو سے اپنے خاص تعلق کا اظہار فرمایا۔ حدیث میں ہے: **أحبُ الأسماءِ إلی اللّٰہِ عبدُ اللّٰہ و عبدُ الرحمٰن** ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہے (مسلم عن ابن عمر). اس جیسی احادیث کی بنا پر صحابہ میں عبداللہ نام رکھنے کا رواج بہت بڑھ گیا تھا۔ مشہور ناقد ابن الصلاحؒ کا بیان ہے کہ صحابۂ کرام میں عبداللہ نام کے ۲۲۰، افراد موجود تھے۔ حافظ عراقیؒ نے ۳۰۰ کی تعداد بتلائی ہے (المنهل اللطيف فی اصول الحديث: ۲۳۰)۔ حدیث میں گوکہ صراحتاً صرف دوناموں کی افضلیت وارد ہے؛ لیکن محدثین نے قرائن اور شواہد کی بنا پر اس فضلیت میں عموم پیدا کیا ہے اور اور یہ فضلیت ہر اس نام میں ثابت فرمائی، جس میں اللہ تعالیٰ کے کسی نام کے شروع میں لفظِ عبد کا اضافہ کیا جائے۔ مشہور ومعروف محدث علامہ قرطبیؒ رقمطراز ہیں: ''ان دوناموں (عبداللہ اور عبدالرحمٰن) کے ساتھ ان کے ہم مثل نام بھی ملحق ہیں جیسے عبدالرحیم، عبدالملک، عبدالصمد۔ اور ایسے نام اللہ کو اس لیے محبوب ہیں کہ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے لیے بھی اس کے شایاں شاں وصف (معبود ہونا) موجود ہے اور انسان کے شایانِ شان وصف (یعنی عابد ہونا) بھی موجود ہے۔ طبرانی میں ایک حدیث بھی ہے: ''اذا سَمَّیْتُمْ فَعَبِّدُوْا''، یعنی جب نام رکھو تو اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ

اپنی بندگی کا اظہار کرو‘‘ (یعنی اللہ تعالی کے ذاتی یا صفاتی نام کے شروع میں لفظ ’’عبد‘‘ کا اضافہ کر کے نام رکھو) (تکملة فتح الملهم ملخصًا: ٤/ ١٧٩)۔ بعض محدثین نے افضلیت انھیں دو ناموں کے ساتھ محدود کی۔ ان کے پیش نظر ان احادیث کے الفاظ ہیں جن میں ’’عبداللہ اور عبدالرحمٰن‘‘ کو افضل نام قرار دیا گیا۔ اس کی علت یہ بھی لکھی ہے کہ ان ناموں میں کمالِ بندگی کا اظہار ہے جو دیگر ناموں جیسے عبدالصمد، عبدالقاہر وغیرہ میں موجود نہیں اور ’’اللہ اور رحمٰن‘‘ اللہ کے مشہور نام بھی ہیں (ملخص من فيض القدير للمناوی: ٣/ ٢٤٦، زاد المعاد: ٢/ ٣١٠)۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: مقاصدِ شریعت میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی کا ذکر لوگوں کے ذکر واشغال میں بھی شامل ہو؛ تاکہ تمام چیزیں حق کا تکلم کرنے والی ہوں اور جب نومولود کا نام اس کے مطابق رکھا جائے تو یہ توحید کی جانب واضح اشارہ ہوگا۔ نیز عرب اور دیگر اقوام کا رواج تھا کہ وہ اپنے معبودوں کے نام پر نام رکھتے تھے۔ پھر جب اللہ کے نبی ﷺ آداب توحید کی تبلیغ کے لیے آئے تو اس کا اثر ناموں پر پڑنا ضروری تھا۔ اور دو نام (عبداللہ، وعبدالرحمٰن) دیگر ناموں کی بہ نسبت زیادہ پسند کیے گئے؛ کیوں کہ ان میں اللہ کے دو مشہور ومخصوص ناموں (اللہ ورحمٰن) کی جانب نسبت ہے اور ان کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوتا (حجة الله البالغة: ٢/ ٤٤٧)۔ محدثین نے اگرچہ ان مذکورہ ناموں کو افضل قرار دیا؛ لیکن مشہور ومعروف فقیہ ومحقق ابن عابدینؒ لکھتے ہیں: سب سے افضل نام محمد ہی ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے لیے سب سے اچھے نام کا انتخاب فرمایا۔ حدیث میں جو عبدالرحمٰن اور عبداللہ کی فضیلت وارد ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے محقق موصوف لکھتے ہیں کہ فضیلت صرف اس لیے ہے کہ اس زمانے میں شرکیہ نام رکھنے کا رواج ہوگیا تھا، تو اس کو مٹانے کے لیے حضور ﷺ نے ان ناموں کو محبوب قرار دیا اور یہ چیز ’’محمد‘‘ کے افضلیت کے منافی نہیں (شامی ٩/ ٥٩٨)۔ عتبی کا بیان ہے کہ اہل مکہ کہا کرتے تھے: ’’مَا مِنْ بَيْتٍ فيه اسمُ مُحَمَّدٍ إلَّا رَأَوْا خَيْراً وَ رُزِقُوا‘‘ یعنی جس گھر میں محمد نام کا کوئی آدمی ہو تو گھر والے خیر دیکھتے ہیں اور انھیں رزق کی کمی نہیں ہوتی (الموسوعة الفقهية عن مواهب الجليل: ١١/ ٣٣٢)۔ ابوامامہ باہلیؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس کا کوئی بچہ پیدا ہوا اور اس کا نام (برکت اور احترام میں) محمد رکھا تو باپ اور بچہ دونوں جنت میں ہوں گے۔ حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن درجہ کی ہے (رد المحتار: ٩/ ٥٩٨)۔ بعض حضرات لکھتے ہیں کہ عبدیت والے ناموں کو، انبیاء کے ناموں کے بعد فضیلت حاصل ہے (مرقاة: ٩/ ١٠)؛ لیکن اس بات میں دو رائے نہیں کہ عبدیت والے ناموں میں فضیلت اور برکت ہے۔ عبدیت والے ناموں میں ایک بات ملحوظ رکھی جائے کہ صرف انھیں ناموں

کے شروع میں لفظِ عبد کا اضافہ کیا جائے جن کو شریعت نے اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں شمار کیا ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں یعنی جو شریعت میں منصوص ہیں۔ جو نام وارد نہیں ان کی جانب لفظِ عبد کی نسبت کرکے نام رکھنا درست نہیں ہیں؛ چنانچہ لوگ عبدالسبحان، عبدالطالب وغیرہ نام رکھتے ہیں جو کہ غلط ہے؛ کیونکہ یہ نام اللہ کے لیے ثابت نہیں (تسمیة المولود ملخصاً: ٤٦)

پیغمبروں اور صالحین کے نام رکھنا

پیغمبروں اور صالحین کے نام رکھنا بھی بہتر اور مستحب ہے۔ مشہور تابعی سعید ابن المسیبؒ لکھتے ہیں: **أحبُ الأسماءِ إلى اللّٰهِ أسماءُ الأنبياء** یعنی اللہ کے نزدیک محبوب ترین نام انبیاء کے نام ہیں (الموسوعة: ۱۱/ ۳۳۳) اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: **تُسَمُّوا بأسْماءِ الأنبياءِ، وَأحَبُّ الأسماءِ إلى اللّٰهِ عبدُ اللّٰه و عبدُ الرحمٰن و، و أصْدَقُها حَارثٌ و هَمَّامٌ، و أقْبَحُهَا مُرَّة وَ حَرْبٌ** ''انبیاء کے نام رکھو۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔ اور سچا نام حارث اور ہمّام ہے۔ برا نام مُرہ اور حرب ہے'' (أبو داؤد)۔ اس حدیث سے انبیاء اور عبداللہ وعبدالرحمٰن جیسے نام رکھنے کا استحباب معلوم ہوا، ساتھ ساتھ حارث اور ھمام کو صحیح اور سچا نام قرار دیا گیا اور حرب اور مرہ کو برا نام قرار دیا گیا۔ حارث اور ہمام کو سچا اور صحیح نام قرار دینے کی وجہ حافظ منذریؒ نے یہ لکھی ہے کہ یہ انسان کی حقیقت کے بالکل ہم آہنگ ہے؛ کیونکہ حارث کے معنی کمانے والے اور ہمام کے معنی اردہ کرنے والے، کے ہیں۔ انسان کمانے اور ارادہ کرنے میں ہی رہتا ہے؛ اسی لیے ان دو ناموں کو سچا نام قرار دیا گیا (الترغیب: ۳/ ۱۹). حرب اور مرہ بُرے نام اس وجہ سے قرار دیے گئے کہ ان میں منفی معنی موجود ہے؛ کیوں کہ حرب کے معنی جنگ اور مُرّہ کے معنی کڑوے کے ہیں۔ نیز اس میں امکان یہ بھی ہے کہ لوگ بدشگونی لیں، اسی وجہ سے حدیث میں ان کو قبیح اور برے نام قرار دیا گیا (مرقاة: ۹/ ۳۱)۔ حدیث میں ہے کہ: ''**تُسَمُّوا بِاسْمِیْ وَلَا تُكَنُّوْا بِكُنْيَتِیْ**''، یعنی میرا نام رکھو لیکن میری کنیت نہ رکھو (مسلم)۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا نام رکھنا بھی مستحب ہے۔ کنیت سے منع کرنے کی وجہ یہ تھی؛ تاکہ آپ ﷺ کے تعارف اور پہچاننے میں التباس نہ ہو (تکملة فتح الملهم)۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ جب میں نجران گیا، تو انھوں نے سوال کیا کہ تم قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے بارے میں پڑھتے ہو ''**يا أختَ هارونَ**'' (یعنی ھارون کی بہن) حالانکہ مریم ہاروں کی بہن نہیں ہوسکتی؛ کیونکہ دونوں کہ درمیان بڑے بڑے زمانے کا فاصلہ ہے۔ تو مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں اللہ کے نبی کے پاس آیا اور یہی سوال دریافت کیا۔ تو اللہ کے رسول نے فرمایا: **انهم كانوا يُسَمُّوْنَ بِأنْبِيَاءِهِمْ وَالصَّالِحِيْنَ قَبْلَهُمْ** ''وہ لوگ اپنے

انبیاء اور نیک لوگوں کا نام رکھتے تھے (مسلم)۔ اسی بنیاد پر محدثین نے لکھا ہے کہ انبیاء اور امت کے صالح شخصیات کا نام رکھنا بھی امر مسنون ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ رقمطراز ہیں: ''کچھ لوگ اپنے بچوں کا نام اپنے اسلاف کے نام پر رکھنے کو پسند کرتے ہیں۔ اس میں دین کی تعظیم کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اقرار ہے کہ بچے دین دار ہیں'' (حجة الله البالغة: ۲/ ٤٤٧)۔ حضرت زبیر ابن العوام نے اپنے دس بیٹوں کے لیے شہدائے صحابہ کے اسماءِ گرامی تجویز کیے، اس امید پر کہ ان کے نقش قدم پر چل کر شہادت کا درجہ حاصل کریں گے۔ حضرت طلحہ نے اپنے بچوں کے نام انبیاء کے نام پر رکھے تھے (الموسوعة الفقهية)۔ اسی طرح حضور ﷺ حضرت ابوموسی اشعری کا نام ابراہیم رکھا (مسلم: ٥٧٣٩)۔ ایک صحابی کا نام یوسف رکھا (الأدب المفرد: ٣٧٩)۔ انبیاء اور اور گذشتہ صالحین کے ناموں میں بہر حال ایک مثبت تاثیر ہے جو انسان کے نفس و دماغ پر پڑتی ہے اگر انسان واقعی باشعور ہو اور نام کے پس منظر اور تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ حضرت عمرؓ کے سلسلے میں جو منقول ہے کہ وہ انبیاء کے نام رکھنے پر سخت نکیر کرتے تھے؛ حتیٰ کہ انھوں نے کوفہ اپنا حکم نامہ روانہ کیا، جس میں لکھا تھا کہ ''کوئی بھی نبی کا نام نہ رکھے'' (شرح المسلم للنووی: ١٤/ ١١٣)، وہ صرف اس وجہ سے تھا کہ لوگ انبیاء کے ناموں کا احترام نہیں کرتے تھے اور ان کی عظمت سے ناواقف تھے، جیسا کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ محمد بن یزید بن الخطاب نامی شخص کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور اسے کہا کہ میں جائز نہیں سمجھتا کہ تم اللہ کے رسول ﷺ کے نام کو برا بھلا کہو۔ چنانچہ انھوں نے اس آدمی کا نام بدل کر عبد الرحمٰن نام رکھا (شرح المسلم للنووی: ١٤/ ١١٣، مرقاة المفاتيح: ٩/ ١٠)۔ گویا ان کا مقصد ان ناموں سے روکنا نہیں تھا؛ بلکہ اس بات کی جانب متوجہ کرنا مقصود تھا کہ جس کسی نے نبی کا نام رکھا ہے اس پر ضروری ہے کہ وہ اس کی تعظیم کرے۔ حدیث میں بھی اس کی جانب اشارہ کیا گیا، فرمایا: ''**تُسَمُّوْنَ أولادَكُمْ محمداً ثم تُلْعِنُوْنَهُمْ**'' کہ تم اپنے اولاد کا نام محمد رکھتے ہو پھر ان پر لعنت بھی کرتے ہو (جو کہ ایک غیر شرعی فعل ہے) (مرقاة المفاتيح: ٩/ ١٠)۔ اسی بنیاد پر فقہائے احناف نے اپنا نقطۂ نظر قائم کیا کہ اللہ کے اسماء مثلاً رشید، علی وغیرہ، اسی طرح انبیاء وصالحین کے ناموں کی اگر معاشرے میں تحقیر ہوتی ہو، تو ایسے مبارک نام رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے؛ کیونکہ اللہ کی جانب منسوب اسماء، اسی طرح انبیاء کے اسماء کی تعظیم لازم اور ضروری ہے۔ فقیہ ابواللیث لکھتے ہیں: ''میں عجمیوں کے لیے عبد الرحمٰن، عبد الرحیم جیسے ناموں کو پسند نہیں کرتا ہوں؛ کیونکہ لوگ ان کے معانی سے ناواقف ہیں اور حقارت سے پکارتے ہیں'' (درمختار مع رد المحتار: ٩/ ٥٩٨)۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ اللہ اور انبیاء وصالحین کے

ناموں میں بہرحال برکت ہے، وہ حکمتوں سے پُر ہیں؛ فقہاء نے جن اسباب کی بنیاد پر منع کیا ہے، انھیں ہمارے ہی معاشرے اور سوسائٹی نے جنم دیا ہے؛ اس لیے ہم پر اس چیز کی ذمہ داری عائد ہے کہ ان ناموں اور نسبتوں کا صحیح پس منظر جان کر ان کا احترام کریں اور ساتھ ساتھ ان بے حرمتیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے ہی معاشرے میں پیدا ہوئیں۔

ناموں میں حضور ﷺ کی اصلاحات

اللہ کے نبی ﷺ ہر اس نام کو تبدیل کرنے کی کوشش فرماتے تھے جس میں منفی معنی ہوتا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''کان النبی ﷺ یُغَیِّرُ الإسْمَ القَبِیْحَ''، یعنی اللہ کے نبی ﷺ برے نام کو بدلتے تھے (الترمذی: ۲۸۳۹)۔ ایک آدمی کا نام اَصرم تھا۔ حضور کی خدمت میں آیا، آپ ﷺ نے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اَصرم۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ تیرا نام زُرعہ ہے (ابوداؤد)۔ اصرم کٹنے والے یا کاٹنے والے کو کہتے ہیں جو کہ منفی معنی ہے اور زُرعہ کے معنی کھیتی یا بیج کے ہیں جو ایک مثبت معنی ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک صاحبزادی کا نام عاصیہ (گناہگار) تھا۔ حضور ﷺ نے اس کا نام بدلا۔ اور جمیلہ (خوب صورت) نام رکھا۔ (مسلم)۔ (ایک نام ''آسیہ'' لفظِ سین کے ساتھ ہے جو ایک صالح اور نیک خاتون گذری ہیں، ان کی نسبت پر یہ نام رکھنا مستحب ہے)۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ مجھے پسند تھا کہ میں ابوحرب نام کی کنیت رکھوں (حرب، جنگ اور قتال کو کہتے ہیں اور وہ جہاد وقتال کی جانب بہت مائل تھے)؛ چنانچہ جب حسن پیدا ہوئے تو میں نے اس کا نام حرب رکھا (تاکہ میں ابوحرب کی کنیت رکھ سکوں)۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے کہا: میرے بیٹے کا کیا نام رکھا؟ تو میں نے جواب دیا کہ ''حرب''۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ حسن ہے۔ پھر جب حسین پیدا ہوئے میں نے اس کا نام حرب رکھا۔ جب حضور ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کی کیا نام رکھا ہے؟ میں نے کہا حرب۔ حضور ﷺ نے کہا کہ یہ حسین ہے۔ پھر جب تیسرے لڑکے کی پیدائش ہوئی تو میں نے اس کا نام حرب رکھا۔ جب حضور ﷺ تشریف لائے اور نام کے بارے میں سوال کیا تو میں نے کہا: حرب۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ یہ مُحسن ہے (المسندلأحمد: ۷۶۹، المعجم الکبیر: ۴۷۰۸) بعض روایات سے ثابت ہے کہ حسن کا نام حمزہ اور حسین کا نام جعفر رکھا گیا تھا (المعجم الکبیر ۲۷۱۳)۔ ایک آدمی کا نام شہاب (آگ کا شعلہ) تھا۔ حضور ﷺ نے اس کا نام ہشام (سخاوت) رکھا (مستدرك لحاكم: ۷۸۴۳)۔ ایک صحابی کا نام غُراب تھا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اس کا نام مسلم رکھا (طبرانی: ۱۶۳۹۵)۔ غراب کے معنی دوری یا کوے کے ہیں۔ جاہلیت میں کوے سے بدفالی لیتے تھے، اسی وجہ سے یہ نام بدل

دیا۔امام ابوداؤدؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عاص،عزیز،عتلہ،شیطان،حکم،غراب،حباب اورشہاب ناموں کو بدل ڈالا۔(مشکوۃ:۴۷۷۶)۔عاص بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے معنی سختی کے ہیں،عزیز اللہ کا نام ہے، تو عبدالعزیز کہنا درست تھا۔عتلہ کو بدل دیا؛ کیونکہ اس کے معنی شدت اورسختی کے ہے۔شیطان ابلیس کا نام ہے اوراس کے معنی خبیث کے ہے۔حکم کے معنی حاکم ہے جوخوداللہ کی ذات ہے۔غراب کے معنی بعد اور دوری کے ہے۔ نیز یہ ایک گندہ پرندہ (کوا) بھی ہے۔حباب شیطان کا نام ہےاورسانپ کوبھی بولتے ہیں(مرقاۃ ۲٦/۹، المعجم الوسیط). ایک آدمی کا نام زَحم(بمعنی ہجوم اورتنگی) تھا۔ اللہ کے نبی نے نام بدل کراس کا نام بشیر رکھا(المعجم الکبیر: ۱۲۱۵). ایک آدمی کا نام اسود(کالے رنگ والا) تھا،اللہ کے نبی نے اس کا نام بدل کرابیض (سفیدرنگ والا)رکھا(المعجم الکبیر للطبرانی: ۵۸۸٤) لیکن اگرتواضع کے لیے کوئی اپنانام''اسود'' رکھے تو کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ بہت سے صحابہ کا نام اسود تھا۔ جگہوں کے نام بھی اگر برے ہوتے تو اللہ کے نبی ﷺ ان کوبھی بدل دیا کرتے تھے؛ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی کا ایک بستی کا گذرہوا،جس کا نام عفرہ (بنجرزمین) تھا۔اللہ کے نبی نے اس کا نام خُضرہ (سرسبززمین)رکھا (المعجم الکبیر: ۳٤۹). اسی طرح ایک جگہ کا نام''بقیۃ الضلالہ''(گمراہی کے باقی ماندہ) تھا۔اللہ کے نبی ﷺ نے بقیۃ الھدی(ہدایت کا باقی ماندہ)نام رکھا۔ایک قوم سے گذرےاوران سے کہا کہ تم کون ہو؟ بولے: بنوغیّہ(یعنی سرکشی کی اولاد)۔اللہ کے نبی نے اس کا نام بنورِشدہ (ہدایت کی اولاد) رکھا (مصنف عبد الرزاق:۱۹۸٦۲). یہ کچھ واقعات ہیں جنہیں یہاں ذکرکیا گیا،اس طرح کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں موجود ہیں۔تفصیل کے کے لیے حدیث کی کتابوں کی جانب رجوع کیا جاسکتا ہے۔محدثین نے حضور ﷺ کی ان اصلاحات کی وجہ لکھی ہے کہ آپ ﷺ کو برے معنی کے نام ناپسند تھےاورایسے نام جن سے بدشگونی کا اندیشہ ہو سکتا ہو(تکملۃ فتح الملھم، المجموع شرح المھذب للنووی ۸/٤۳٦)۔

(باقی اگلے ماہ)

❁ ❁ ❁

عقائد باطلہ کے مقابلہ کی ضرورت اور اس کا طریقۂ کار

از: مولانا شاہ عالم گورکھپوری
دارالعلوم دیوبند

اسلام میں عقیدہ کو اوّلیت حاصل ہے، پہلے خدا اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور کتابوں پر ایمان رکھنا ضروری ہوتا ہے پھر اس کے بعد ہی اعمال کی ابتدا ہوتی ہے، تفسیر حدیث اور فقہ وغیرہ کی ضرورت بھی اسی شخص کو پڑے گی جس کا پہلے خدا، اس کے رسول اور خدا کی کتابوں پر ایمان ہوگا ورنہ احادیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ علومِ اسلامیہ کو ماننا ایسا ہی بے سود ہوگا جیسے کہ بغیر بنیاد کے عمارت کھڑی کردی جائے۔ عقیدہ کی حیثیت اور اہمیت کسی پر پوشیدہ نہیں؛ مگر حیرت اس بات پر ہے کہ عقائد کی حفاظت کے لیے جو محنت درکار ہے اس میں مجموعی طور پر حد درجہ ہے۔ مدارسِ اسلامیہ میں داخل عقائد کے نصاب پر اور ان کی تعلیم اور انداز تعلیم وتعلّم پر اگر منصفانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے عقائد کے باب میں وہ محنت نہیں کی جاتی جو دیگر ابواب میں دورِ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہے۔

ماضی میں اسلامی عقائد پر جب یونانی فلسفہ نے یلغار کیا تو اس کے فریب کو توڑنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے اس طرح محنتیں کیں کہ یونانی فلسفہ کی جادوگری آج خود فلسفیوں کے لیے مضحکہ خیز بن کر رہ گئی ہے، متکلمینِ اسلام کے وضع کردہ اصولوں نے فلسفہ کے راستے سے آنے والے ارتدادی سیلاب کو نہ صرف یہ کہ قیامت تک کے لیے بند کردیا؛ بلکہ نازک خیال فلسفیوں کو بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا؛ لیکن آج صورتِ حال اس طرح بدل گئی ہے کہ جگہ جگہ فتنے پھیل رہے ہیں، نئے نئے ارتدادی فتنے مسلمانوں کے درمیان جنم لے رہے ہیں، قدیم فلسفیوں کے زہریلے اثرات کو نئی نئی تعبیرات وزبان میں پیش کرکے ایک بار پھر اسلامی عقائد کو مسخ کرنے کی فکر میں بے شمار تنظیمیں

شب و روز مصروف ہیں، اعمال میں تو خود مسلمانوں نے ہی دین کو بغیر ماہرینِ دین کے چلانے کی وکالت شروع کر رکھی ہے؛ لیکن پانی سر سے اتنا اونچا ہو چکا ہے کہ عقائد میں بھی اب دین کو بغیر ماہرینِ دین کے چلانے کی وبا عام مسلمانوں میں پھیلنے لگی ہے، ہر دانشورِ اسلامی عقائد میں رائے زنی کرنا اپنا موروثی حق سمجھنے لگا ہے۔ پھر ملحد دانشوروں کی تلچھٹ مرزا قادیانی اور اُس جیسے دیگر لوگ جیسے شکیل بن حنیف یا راشد شاز وغیرہ، اپنے آپ کو کیوں پیچھے رکھیں؛ چناں چہ وہ بھی مسلمانوں کے درمیان عقائد کی مضبوط تعلیم نہ ہونے کا جی بھر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس خودسری کا بھیانک نتیجہ؛ عقائدِ اسلامیہ کو بازیچۂ اطفال بنانے کی صورت میں نکلے گا، جیسا کہ عام طور پر اب دیکھنے میں بھی آ رہا ہے کہ جگہ جگہ اسلام کے قطعی اور یقینی عقائد و نظریات کو تختۂ مشق بنایا جانے لگا ہے۔ میدان میں بالکل خاموشی کی بات تو نہیں کی جاسکتی؛ لیکن سوائے چند افراد اور دو ایک تنظیموں کے کتنے لوگ ہیں جو اس سیلاب بلاخیز کو روکنے کے لیے فکرمند ہیں؟

فکرمندوں کا بھی حال یہ ہے کہ مرض کی بجائے علامات مرض کے علاج میں لگے ہیں؛ جب کہ فتنوں کی کثرت اِس مرض کی علامت ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ کمزور ہو چکا ہے اُسے مضبوط کیا جائے؛ تاکہ فتنوں سے بچاؤ میں مسلمان خود اپنی طاقت استعمال کرسکیں۔ علاج کا کامیاب طریقہ یہ ہے کہ مرض کو دُور کیا جائے اور براہِ راست مرض کا علاج کیا جائے نہ کہ علامتوں کا؛ لیکن آج کل فتنوں کے پیچھے طرح طرح کی تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں، علامات مرض کے پیچھے دوڑ لگانے والے کچھ لوگ دکھائی دیتے ہیں؛ لیکن اصل مرض کے ازالے کی جانب توجہ کتنے لوگوں کی ہے؟

بلاشبہ اس میدان میں کام کرنے والی تنظیموں پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کے نبھانے میں وہ کوتاہ عمل ہیں؛ لیکن مسئلے کا حل کسی کو موردِ الزام ٹھہرانے میں نہیں؛ بلکہ اس بات میں ہے کہ ایمان و عقائد کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے سدباب کے لیے عقائد اور علم کلام کی تعلیم کے لیے محنت میں کچھ اضافہ کیا جائے اور علم کلام کی تعلیم کو نہ صرف یہ کہ معقولیت و معنویت کے ساتھ اپنے اپنے مکاتب و مدارس کے نصاب کا جزو بنایا جائے؛ بلکہ عام فہم بیانات اور کتابوں کے ذریعہ مساجد کی صبح و شام کی تعلیم کا حصہ بنا دیا جائے۔ متکلمینِ اسلام نے عقائد کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے جو کامیاب و لاجواب علمی اور عقلی اصول دیے ہیں، اُن کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے علاقائی اور رائج زبان و بیان کے ذریعہ عام مسلمانوں میں بھی اتنی صلاحیت پیدا کردی جائے کہ گلی کوچوں میں جنم لینے والی ارتدادی لہروں کا مسکت جواب دینے کی صلاحیت اُن میں پیدا ہو جائے۔

علم کلام جو عقائد کو تحفظ فراہم کرتا ہے اس سے بیگانگی اور ناواقفیت کے سبب آج کا مسلمان اس قدر مرعوب ہوگیا ہے کہ اگر کوئی قادیانی یا شکیلی کسی گلی کوچے میں وسوسہ ڈالے تو ہمارا نوجوان اس کو بہت بڑا تیر سمجھ کر مولانا صاحبوں کے پیچھے پڑ جائے گا کہ اس کا جواب کیا ہے؟ لیکن کوئی عالمِ دین مسجد کے ممبر ومحراب سے معقول سے معقول تر جواب دے دے تو اس کو لے کر قادیانیوں یا شکیلیوں کے پیچھے کبھی نہیں پڑتا کہ تم نے بلاوجہ کا یہ وسوسہ اسلام میں کیوں پیدا کیا ؟ مسلمانوں کے درمیان مرعوبیت کی اس حالت کو اگر ختم کرنا ہے تو اس کے لیے معقول توڑ دریافت کرنا پڑے گا۔ راقم سطور نے اپنے بڑوں کی تحریرات و بیانات کی روشنی میں اس کا جو حل سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دورِ حاضر کی زبان میں علمِ کلام کے دلائل سے مسلمانوں کو مزین کردیا جائے۔ اگر اس باب میں بچپن کی تعلیم مضبوط ہوجائے تو عمر کے ہر مرحلے میں اُن دلائل سے وہ بھرپور فائدہ اٹھائیں گے اور قدیم علمِ کلام کو اپنی من پسند جدید زبان میں پاکر ہر دہریے اور ملحد کا توڑ ؛ وہ خود دریافت کریں گے؛ بلکہ اسلامی عقائد کے روشن ماضی سے خود کو مربوط رکھنے کی ذمہ داری کو بھی وہ محسوس کریں گے۔

قدیم متکلمینِ اسلام کے مضامین کو جدید اور سہل زبان میں بیان کرنے یا سمجھنے کے لیے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، حضرت مولانا محمد مسلم دیوبندیؒ، اسی طرح حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ وغیرہ اکابر دیوبند کے رسائل ومضامین جو بہ طور خاص عقائد اور کلام کے ہی موضوع پر تصنیف کیے گئے ہیں؛ شائقین اور دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نفع بخش ہوسکتے ہیں یا ان بزرگوں کی تحریرات کی روشنی میں اپنے اپنے علاقوں میں پیش آمدہ مخالفینِ اسلام کے اعتراضات ووساوس کے جوابات ؛ نئی نئی مثالوں کے ذریعہ آسان زبان میں ترتیب بھی دیے جاسکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

مسائل وفتاویٰ

کھانے کے بعد کی مشہور دعا کے الفاظ کی تحقیق

کھانے کے بعد کی مشہور دعا میں **وجعلنا** کے بعد **من** ہے یانہیں؟ دینیات (ممبئ) کی کتب میں **وجعلنا مسلمین** لکھا ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

کھانے کے بعد کی مطلوبہ دعا دس سے زائد کتب حدیث میں مذکور ہے اور ساری جگہوں پر ''**وجعلنا مسلمین**'' ''**من**'' کے بغیر ہی ذکر ہے، نیز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ خصائل نبوی (ص:۲۴۹) کے حاشیہ میں شمائل ترمذی میں ''من'' کے بغیر وارد شدہ حدیث کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:

''**هكذا في جميع النسخ الموجودة من الهندية والمصرية، وفي بعض الحواشي بطريق النسخة ''من المسلمين''.**

اس لیے آپ دعا بغیر ''من'' کے ہی پڑھا کریں۔ حوالۂ کتب مندرجہ ذیل ہیں:

أخرجه أبوداؤد: (كتاب الأطعمة، باب ما يقول الرجل إذا طعم، رقم: ٣٨٥٠)، والترمذي: (كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا فرغ من الطعام، رقم: ٣٤٥٧)، وفي "شمائله مع جميع الوسائل": (ما جاء في قول رسول الله – صلى الله عليه وسلم – قبل الطعام، ١/٢٩٠)، والنسائي "في الكبرى": (رقم الحديث: ١٠١٢٠، ١٠١٢١، ١٠١٢٢)، وفي "عمل اليوم والليلة": (رقم: ٢٨٨، ٢٨٩، ٢٩٠)، وابن ماجه: (كتاب الأطعمه، باب ما يقال: إذا فرغ من الطعام، رقم: ٣٢٨٣) وابن السني في "عمل اليوم والليلة" (باب ما يقول: إذا أكل، رقم: ٤٦٤)، وابن أبي شيبة مرفوعًا: (الأطعمة، في التسمية على الطعام، رقم: ٢٤٩٩٢)، وموقوفًا: (رقم: ٢٤٩٩٥)

سوال: کیا کھانے کے دوران یا کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد پانی پینے کا کوئی وقت مقرر ہے؟

جواب: کھانے کے دوران یا کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد پانی پینے کا ایسا کوئی خاص وقت احادیث سے ثابت نہیں؛ البتہ بعض کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد پانی نہیں پیتے تھے، اگر کوئی شخص کھانے کے بعد پانی پی لے یا کوئی شخص کھانے سے پہلے پانی نہ پیئے تو اس کو تارک سنت نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عادت مبارکہ کو طبعی رغبت یا زیادہ سے زیادہ طبی حکمت پر محمول کر سکتے ہیں کہ کھانے کے بعد فوراً پانی پینا طبی لحاظ سے مضر ہے اور پہلے پینا مضر نہیں۔

الجواب صحیح:
حبیب الرحمٰن، محمود حسن بلند شہری، زین الاسلام، وقار علی
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

فخر الاسلام عفی عنہ
دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

==========

سوال: کیا کھانا تناول کرنے سے پہلے نمک کھانا سنت ہے؟ کیا کھانا تناول کر چکنے کے بعد نمک کھانا سنت ہے؟ کیا کھانے سے پہلے یا بعد میں مٹھائی (شیرینی) کھانا سنت ہے؟

جواب: کھانے کی ابتداء اور انتہاء نمکین سے کرنے کو شامی، عالمگیری اور الدر المنتقی وغیرہ میں من جملہ آداب وسنن طعام میں لکھا ہے؛ لیکن مستحب ہونے کا یہ حکم شرعی نہیں ہے؛ بلکہ یہ حکم عادی ہے۔ (امداد الفتاویٰ: ۱۱۱/۴) میٹھی چیز کھانے کے بارے میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے، حدیث شریف میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میٹھی چیز اور شہد پسند کرنا مذکور ہے؛ لیکن اس کا تعلق کھانا کھانے سے پہلے یا بعد سے نہیں ہے اور نہ کسی حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

الجواب صحیح:
حبیب الرحمٰن، محمود حسن بلند شہری، زین الاسلام، وقار علی
مفتیانِ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

فخر الاسلام عفی عنہ
دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

❁ ❁ ❁

احوال وکوائف

از: مولانا محمداللہ قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی نے تمام مدارس اسلامیہ اور اقلیتی اداروں سے اپیل کی کہ یوم جمہوریہ کو باوقار انداز میں منایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں جمہوری نظام حکومت اور سیکولر دستور کی قدر کرنی چاہیے جس کے تحت تمام ہندوستانیوں خصوصاً اقلیتوں کے مذہبی واقلیتی حقوق کو تحفظ حاصل ہے۔ یوم جمہوریہ ۲۶؍جنوری کو دارالعلوم دیوبند میں بھی پرچم کشائی عمل میں آئی۔ اس موقع پر دارالعلوم کے طلبہ نے متعدد ہفتہ واری اور ماہانہ دیواری جرائد نکالے جس میں انھوں نے تحریک آزادی اور جمہوریت کے مختلف گوشوں پر مضامین لکھے اور مجاہدین آزادی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

برہما کماری وفد کا دورۂ دارالعلوم

ماؤنٹ آبو (راجستھان) سے ہندو مذہبی تحریک 'برہما کماری' کے ایک وفد نے یکم فروری کو دارالعلوم دیوبند کا دورہ کیا۔ وفد کی قیادت کر رہی بی کے جیوگنی گیتا صاحبہ نے دارالعلوم کی امن و انسانیت کے پیغام کو سراہا اور دارالعلوم کے ذریعہ دی جانے والی مذہبی اور روحانی تعلیم کو عظیم تحفہ قرار دیا۔ وفد میں راج یوگی، برہما کمار راج سنگھ، بی کے کانتا، بی کے سنگیتا اور اروند شامل تھے۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی نے وفد کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ دارالعلوم کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ دیگر مذاہب کے غیر سیاسی رہنما دارالعلوم آئیں اور یہاں کے نظام تعلیم وتربیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

❁ ❁ ❁

وفیات

از: مولانا محمداللہ قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم رائے پوری کا انتقال

۱۳؍فروری ۲۰۱۸ء (۲۶؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۹ھ) کو خانقاہ رائے پور کے متولی وسرپرست حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوریؒ کے سانحۂ انتقال پیش آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! آپ ایک عرصہ سے علیل اور صاحب فراش تھے۔ حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت مفتی صاحب کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کیا اور حضرت کے متعلقین کو تعزیت پیش کی۔ دارالعلوم دیوبند میں ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کرائی گئی۔

حضرت مفتی صاحب نہایت خدا رسیدہ بزرگ تھے اور دور دور تک آپ کا فیض جاری تھا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کی ولادت ہوئی اور رائے پور میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اولاً مظاہر علوم سے فراغت کے بعد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے حکم پر مدرسہ خادم الاسلام باغونوالی میں کئی سال تک درس دیا۔ پھر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے ایماء پر مظاہر علوم سہارن پور منتقل ہوگئے جہاں درس وتدریس کے ساتھ دارالافتاء کی خدمات بھی آپ کے سپرد تھیں۔ مظاہر علوم میں ایک عرصہ تک علم خدمت کرنے کے بعد خانقاہ رحیمیہ کی سرپرستی قبول کی اور سالکین طریقت کی رہنمائی میں پوری زندگی بسر کردی۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مدرسہ گلزار رحیمی اور خانقاہ رحیمیہ کو نعم البدل عطا فرمائے اور ہر طرح کے شرور وفتن سے اس کی حفاظت فرمائے۔ آمین!

❁ ❁ ❁